Monthly
Arzang
Lahore

راوی فاؤنڈیشن کے زیرِاہتمام مسلسل اشاعت کے 25 کامیاب سال

ماہنامہ

ارژنگ لاہور

ستمبر ۲۰۲۵ء

مدیرِاعلیٰ:
عامر بن علی

مدیران:
حسن عباسی
لبنیٰ صفدر

مصور: ایڈورڈ منک

ناروے کے مصور ایڈورڈ منک تقریباً بیس برس تک اوسلو کے قریب ایک قصبے اوسگورسترانڈ میں رہے اور انہوں نے اپنی زندگی کی شاہکار پینٹنگز تخلیق کیں۔ منک ایک متوسط طبقے کے خاندان میں پیدا ہوئے جو کہ انتہائی خراب صحت سے دوچار تھا۔ منک ابھی صرف پانچ سال کے تھے کہ ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ بڑی بہن جب 14 برس کی ہوئی تو وہ بھی تپ دق کے مرض سے چل بسی۔ ایڈورڈ منک کے ذہن پر ان اموات نے گہرا اثر ڈالا اور انہوں نے 86-1885ء میں اپنی شاہکار پینٹنگ سک چائلڈ تخلیق کی۔ لڑکپن میں ہی ان کے والد اور بھائی کی بھی موت ہو گئی اور ایک بہن کو ذہنی بیماری لاحق ہو گئی۔ بیماری، پاگل پن اور موت جیسا کہ انہوں نے کہا: ''وہ سیاہ فرشتے تھے جو میرے جھولے کی نگرانی کرتے رہے اور ساری زندگی میرے ساتھ رہے انہوں نے کئی سیلف پورٹریٹ پینٹ کیے جہاں ان کا کچھ جسم پہلے ہی ڈھانچے میں تبدیل ہو رہا ہے''۔ ایک سیاہ اور سفید پورٹریٹ میں ان کے بازو کو محض ہڈیوں کے طور پر دکھایا گیا ہے۔ بہت سے لوگوں نے ان کے کام کو اداس اور بہت پریشان کن قرار دیا، بقول منک ''میں نے اپنی زندگی اور اس کی اہمیت کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے دوسروں کی زندگی کے بارے میں بھی ایسا کرنے میں مدد کرنے کا ارادہ کیا''۔۔۔ منک نے اپنی ساری زندگی اپنے فن اور اپنے احساسات کے بارے میں اظہار کیا۔

میں خود کو پبلک پراپرٹی سمجھتا ہوں
مجھے سب اچھے لگتے ہیں

اہل قلم کو سیاست میں فکری سطح پر حصہ لینا چاہیے

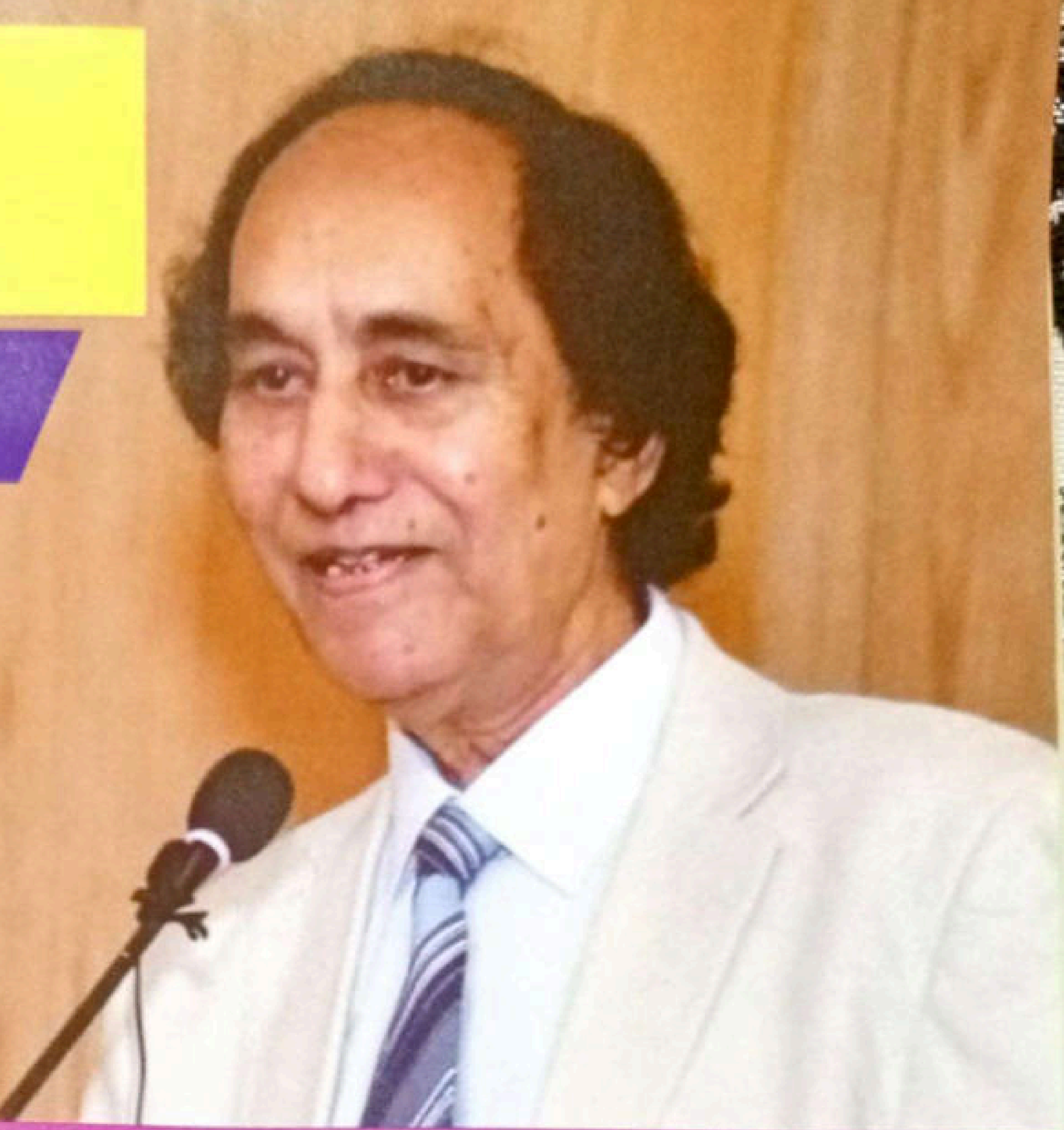

پرائیڈ آف پرفارمنس
معروف شاعر
نذیر قیصر
سے مدیرِ اعلیٰ ارژنگ، معروف شاعر،
کالم نگار اور سفر نامہ نگار **عامر بن علی** کی خصوصی گفتگو

تخلیق ظاہر اور باطن کے درمیان خواب کی طرح ہوتی ہے جسے چھو کر مجسم کرنا پڑتا ہے

میری پیدائش 5 جنوری 1945ء کو ہوشیار پور میں ہوئی جو والدہ کا شہر تھا، والد کا تعلق جالندھر سے تھا۔ ابتدائی دنوں میں ہی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ والد نے خاندان کے اصرار کے باوجود دوسری شادی نہیں کی۔ ملازمت کے سلسلے میں والد کو جہلم آنا پڑا جہاں ان کے دیرینہ دوست لالا اوتار نرائن گجرال بھی رہتے تھے جن کا تعلق بھی جالندھر سے تھا۔ ان کی بیگم نے میری ابتدائی پرورش کی۔ اوتار نرائن گجرال وہی ہیں جن کے بیٹے اندر کمال گجرال تھے جو انڈیا کے وزیراعظم بھی رہے اور ایک بیٹے ستیش گجرال نے مصوری میں عالمی شہرت حاصل کی۔ جہلم میں رہتے ہوئے میں نے پاکستان بنتے ہوئے اور بہت کچھ ٹوٹتے بکھرتے ہوئے دیکھا۔ پہلے مجھے آرمی سکول میں داخل کرایا گیا جہاں پر صبح کی جسمانی ورزشیں میرے لیے مشکل تھیں پھر مجھے والد نے کانفرنسٹ سکول میں داخل کرا دیا جہاں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ پھر لاہور اور ملتان میں

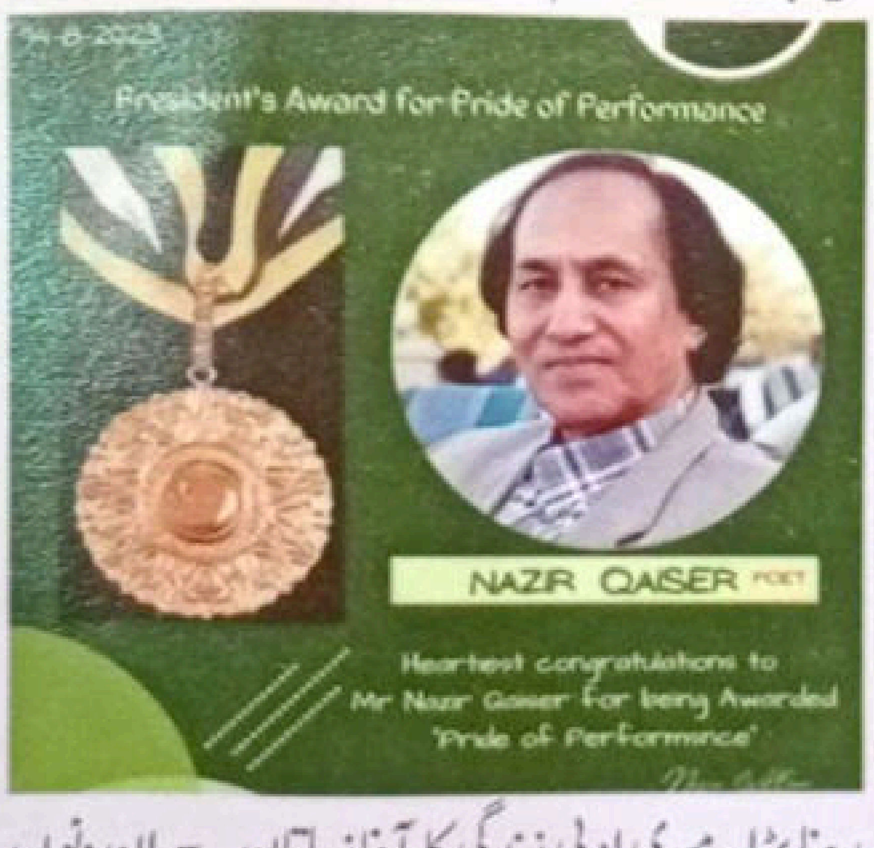

رہنا پڑا۔ میری ادبی زندگی کا آغاز ملتان سے ان دنوں ضیاء صدیقی صاحب کے گھر طرحی مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ بہت سی طرحی غزلیں کہیں جنہیں ریاضت اور عشق

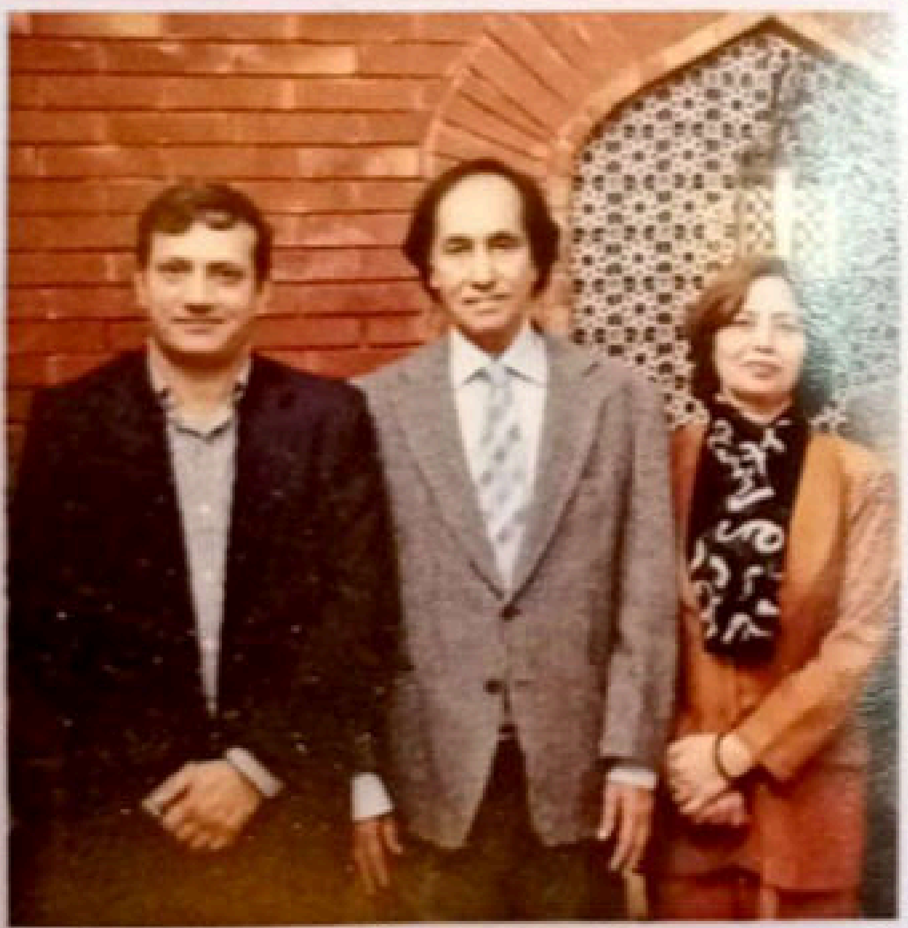

کی ہنرمندی جان کر بعد میں تلف کر دیا۔ ملتان میں عاصی کرنالی، ارشد ملتانی، ریاض انور، صادق مصور، زوار حسین، ایاز صدیقی، حزیں صدیقی سے دوستی رہی۔ 1962ء میں باقاعدہ لاہور ماڈل ٹاؤن میں رہائش اختیار کر لی جہاں پر فیض احمد فیض، حفیظ جالندھری، اعجاز حسین بٹالوی، علی سفیان آفاقی، عابد حسن منٹو جیسی شخصیات سے ملاقاتوں نے بہت کچھ دیا۔ ماڈل ٹاؤن میں عطاء الحق قاسمی جیسے ہم عمر دوست بھی ملے۔ لاہور آنے سے پہلے ہی ناصر کاظمی اور حبیب جالب سے بھی دوستی تھی۔ فنون اور لیل و نہار میں شائع ہونے کی وجہ سے احمد ندیم قاسمی اور صوفی تبسم سے قلمی آشنائی تھی۔

بقیہ اندرونی صفحات پر

CamScanner

راوی فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کے 25 کامیاب سال

MONTHLY Arzang LAHORE

عالمی سطح پر اردو ادب کا ترجمان

ماہنامہ ارژنگ لاہور

ستمبر 2025ء جلد 26 شمارہ 9

فہرست

نعت ' 2

گوشۂ حمد و نعت: نسیم سحر ' خواجہ غلام جیلانی عازم / 3 تا 4

مضامین:

- تاریخی یوم میلادالنبی ﷺ / جسٹس (ر) میاں نذیر اختر ' 5
- شہید حکیم محمد سعیدؒ سے وابستہ کچھ یادیں ' / غالب عرفان ' 9
- ہم بھی وہاں موجود تھے / جمیل یوسف ' 11
- اطہر رضوی (مرحوم) کی "چہرے، باتیں، یادیں لوگ" / ستیہ پال آنند 15

گوشۂ طنز و مزاح:

- ناروے کا بابا مستان شاہ / عطاء الحق قاسمی ' 17
- اشرف المشر وبات / امجد محمود چشتی ' 19
- منیر نیازی کی بذلہ سنجی / عامر بن علی ' 20

شاعری: 22 تا 23

- علی رضا کا نعتیہ مجموعہ "درود پڑھتے ہوئے" / حسن عباسی ' 24
- محبت: مشرق و مغرب کی ازلی داستان / لبنیٰ صفدر ' 26
- بھگت سنگھ شہید اور تحریک آزادی / ثوبیہ شاہ ' 32
- سچے جذبوں کا جدت پسند شاعری اور ادیب... صادق راہی / لیاقت علی منہاس ' 34

شاعری: 36 تا 37

- بقیہ انٹرویو: نذیر قیصر ' 38
- بقیہ انٹرویو: عمران شناور ' 40

شاعری: 42

- گدرو یٹرنری میڈیسن سٹور / نوید عائل ' 43
- دکھ گھات لگائے بیٹھا ہے / فائزہ صابری نوا ' 44

افسانے:

- چھٹکارا / رابنسن سیموئیل گل ' 47
- پہلی محبت / محمد شفیق پہاڑیو ' 49
- گاما پہلوان......رستم جہان / علامہ عبدالستار عاصم ' 50
- ادبی تقریبات ' 55

مدیر اعلیٰ

- عامر بن علی

مدیران

- حسن عباسی
- لبنیٰ صفدر

مجلس ادارت

- ڈاکٹر جعفر حسن مبارک

مجلس مشاورت

- ارشد نذیر ساحل (سپین)

کمپوزنگ زرناب کمپوزنگ 0321-4730769

فوٹوگرافر نعمان حسن 0333-4918383

پتہ برائے خط و کتابت

ماہنامہ ارژنگ F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

0300-4489310

سالانہ ممبر شپ

ماہنامہ "ارژنگ" کے سالانہ خریدار بننے کے لیے نام اور شناختی کارڈ نمبر پر مبلغ -/1500 روپے بذریعہ موبی کیش رقم بھیجیں اور سالانہ خریدار بن جائیں۔

31204-7298386-9: ... 0300-4489310

Far East Marketing Co.

Samana Mansion 6.5 Koanp-Minami 1-6-5
Suginami-Ku, Tokyo, 108-0003 Japan
Email: femc1@hotmail.com

CamScanner

نعت

سرکار ﷺ کے حکمت بھرے احکام کے صدقے
اُس نُورِ مجسم کے ہر اِک کام کے صدقے
ہر عہد کا انساں کرے توصیفِ محمد ﷺ
ہر قلبِ مطہر ہے اِسی نام کے صدقے
سرکار ﷺ نے اِنسان کی قِسمت کو سنوارا
اللہ کے اُس آخری پیغام کے صدقے
مایوس بشر کوئی نہ ہو رحمتِ رب سے
اسلام کے رحمت بھرے پیغام کے صدقے
تا عمر بصد شوق کہوں نعتِ محمد ﷺ
بخشش مری ہو جائے اسی کام کے صدقے
ہر ایک صحابیؓ کا تھا اندازِ تخاطب
ماں باپ مرے آپ ﷺ کے ہوں نام کے صدقے
لیتا ہوں محبت سے سدا نامِ محمد ﷺ
ہوتا ہوں دل و جان سے اس نام کے صدقے
اِس بندۂ عاصی کو ملے اِذنِ حضوری
ہو چشمِ کرم آپ ﷺ کے اکرام کے صدقے
سرکار ﷺ کے قدمین میں اِک شام جو گزرے
تا عمر ہوں تحسین مری اُس شام کے صدقے
زہراؓ و علیؓ ہوں کہ امامینؓ ہوں اختر
جاں آلِ محمد کے ہر اِک نام کے صدقے

لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللهِ (الزمر: من آیت)
ترجمہ (لوگو) مایوس نہ ہونا اللہ کی رحمت سے

جسٹس (ر) میاں نذیر اختر / لاہور

ہو کرم کی نگہ ' میری جانب ذرا
تجھ پہ لاکھوں سلام اے حبیبِ خدا!
حشر میں بھی رہے لطف کا سلسلہ
اے مرے مصطفیٰ! تجھ پہ لاکھوں سلام
تاجدارِ عرب ، پادشاہِ عجم
قبلہ گاہِ ادب ، محتشم، محترم
منبعِ رحمت و لطف و جود و کرم
مرحبا مرحبا! تجھ پہ لاکھوں سلام
میں گداگارِ اُلفت، اے آقا! ترا
عطا کیجیے ٹکڑا خیرات کا
صدقہ حسنینؓ کا ، بہرِ مشکل کشاؓ
آپؐ ہیں باعثِ خلقتِ دو جہاں
رونقِ سرزمیں، جلوۂ آسماں
راحتِ انس و جاں ، مطلبِ عاشقاں
سرورِ انبیاء! تجھ پہ لاکھوں سلام
بزم میں باعثِ زندگی آپؐ ہیں
رونقِ آسماں ، یا نبیؐ! آپؐ ہیں
دردِ خواہِ الم ہر گھڑی آپؐ ہیں
والیؐ دو سرا! تجھ پہ لاکھوں سلام
کس مپرس و حزیں، زائرِ بے ادا
بے نوا ، بے نسب اُمتی ہے ترا
عاقبت میں رہے تیرا ہی آسرا
لاج رکھیو شہا! تجھ پہ لاکھوں سلام

عبدالقیوم زائر / امریکا

انؐ کی یادوں سے جو سرشار رہا کرتے ہیں
وہ کہیں بھی ہوں مدینے میں ہوا کرتے ہیں
لے کے آئی ہے یہ پیغام مدینے کی ہوا
سنگِ طیبہ بھی مجھے یاد کیا کرتے ہیں
انؐ کے در کا ہوں بھکاری یہی پہچان مری
ہے عنایت کہ گداؤں میں گنا کرتے ہیں
میرے آقاؐ نے بلایا ہے مدینے ہم کو
یوں گداؤں پہ نوازش وہ کیا کرتے ہیں
انؐ کی مرضی سے ہی کہتا ہوں میں نعتیں اُن کی
وہ کرم سے مجھے الفاظ عطا کرتے ہیں
نعت پڑھتے ہوئے سرشار محبت ہو کر
حاضری میں بھی حضوری کا مزہ کرتے ہیں
وہ تو حسانؓ کے دستے میں ہوئے ہیں شامل
جو بھی سرکارؐ مدینہ کی ثنا کرتے ہیں
ہو ہی جاتے ہیں زیارت سے سے مشرف اک دن
جو بھی آقاؐ کی زیارت کی دعا کرتے ہیں
انؐ کے قدموں میں میسّر ہو مدینے مدفن
ہم تو جاوید یہ مولا سے دعا کرتے ہیں

جاوید منظور / لاہور

مدینہ کے نظاروں میں نظر کی آزمائش ہے
ادب کا ہے مقام ایسا بشر کی آزمائش ہے
عقیدت کے تقاضوں میں شریعت کے مسائل بھی
حقیقت میں درِ آقاؐ پہ سر کی آزمائش ہے
طوافِ خانۂ کعبہ طوافِ روضۂ اطہر
توازن کے لیے شمس و قمر کی آزمائش ہے
وہاں پر امتحاں دن کا وہاں پر رات کی پرسش
فرائض میں وہاں شام و سحر کی آزمائش ہے
دیارِ کوچۂ محبوب میں ہوں سُرخ رو کیسے
سو چشم و لب دل و جان و جگر کی آزمائش ہے
ہوائے طیبہ کے آگے نگوں کرتے ہیں سر کیسے
گلوں کی اور غبارِ رہگذر کی آزمائش ہے

حسن عباسی / لاہور

CamScanner

نسیمِ سحر/راول پنڈی

ازل سے ابد تک فقط آپؐ ہی
مجسم محبت، شہِ دو سرا

کیوں نہ ہوتے اس سفر کے سب مراحل باوقار؟
آپ کی برکات شامل اس میں ہوتی ہیں ضرور
ذکرِ آقا کے سبب ہوتی ہے محفل باوقار
خیرگی کرتی نہیں، یہ آنکھ میں چبھتی نہیں
یعنی انوارِ مدینہ کی ہے جھلمل باوقار
وہ ضرورت مند کی تحقیر کرتے ہی نہ تھے!
اُن کے در پر جا کے ہو جاتا تھا سائل باوقار
آپ کی آمد سے باتوقیر وہ خطہ ہوا
باوقار اُس کا سمندر، اُس کا ساحل باوقار
قبل از اسلام تھے جو جہل کے سائے تلے
آپ کے دم سے ہوئے وہ سب قبائل باوقار
میرے آقا کی بدولت آج بھی دنیا میں ہے
درمیانِ حق و باطل حدِ فاصل باوقار
اس سفر کے ہر قدم پر کیوں نہ سجدہ ہم کریں
دھیان میں جب ہو مدینے جیسا حاصل باوقار
عشقِ آقاؐ میں جو مستغرق رہے ہر دم نسیم
اُس کا خارج بھی مصفّٰی، اُس کا داخل باوقار

یہ دل جو وقفِ درود و سلام ہو جائے
"شعورِ مدحتِ خیرالانام ہو جائے"
کرم یہ اے مرے عالی مقام، ہو جائے
مدینے جاؤں، وہیں پر قیام ہو جائے
مری حیات کو یوں بھی دوام ہو جائے
بس ایک ورد پہ "جندڑی" تمام ہو جائے
درود شب سے ہو آغاز اور سحر تک ہو
درود خوانی میں ہر صبح، شام ہو جائے
کروں ارادہ میں جب بھی مدینے جانے کا
وجود وقفِ درود و سلام ہو جائے
اُدھر کو جاتے ہوئے جتنی تیز گامی ہے
پلٹ کے آتے ہوئے سست گام ہو جائے
مرے حضور، مرے لاشعور کی حد تک
"شعورِ مدحتِ خیر الانام ہو جائے"
قسم خدا کی، کرے گی اُنہی کا ذکر سدا
یہ کائنات اگر ہم کلام ہو جائے
پیامِ امن مدینے سے ایسا جاری ہو
کہ ساری دُنیا ہی دارالسلام ہو جائے
تڑپ رہا ہوں میں مدت سے حاضری کے لیے
ملے جو اذن تو حاضر غلام ہو جائے
جو اُن کی شان میں گستاخ لب ہلائے کوئی
وہیں پہ تیغ مری بے نیام ہو جائے
مجھے غلامی کا منصب عطا ہو، میرے حضور
مرا یہیں پہ متعین مقام ہو جائے
بس ایک نسخہ ہے دُنیا سنوارنے کا نسیم
نفوذِ سیرتِ عالی مقام ہو جائے

کہاں میری جرات، شہِ دو سرا
کہ لکھ پاؤں مدحت، شہِ دو سرا
کروں پیش میں بھی درود و سلام
اگر ہو اجازت، شہِ دو سرا
سبھی آپؐ کی، آپؐ کی نذر ہیں
یہ حرفِ عقیدت، شہِ دو سرا
شفاعت کے طالب ہیں یہ آپؐ سے
سرشکِ ندامت، شہِ دو سرا
ازل سے ابد تک فقط آپ ہی
مجسم محبت، شہِ دو سرا
سفر کے مقاصد سکھاتی ہوئی
مدینے کو ہجرت، شہِ دو سرا
ادب سے نہ لے کوئی نام آپؐ کا
بھلا کس کی جرأت، شہِ دو سرا؟
عمل آپؐ کا بھی مثالی بنا
نمونہ ہے سیرت، شہِ دو سرا
کرم مجھ سے عاصی پہ بھی آپ کا
عنایت، عنایت، شہِ دو سرا
کمالِ کلام آپ کا تھا نسیم
بلاغت، حلاوت، شہِ دو سرا

آقا حضور کا جو ثناء خوان ہو گیا
وہ شاملِ قبیلۂ حسان ہو گیا
کر پایا جو بھی پیرویِ سیرتِ رسول
گویا نئے سرے سے مسلمان ہو گیا
ابجد کے سب حروف ردیفوں میں ڈھل گئے
صد شکر، میرا نعتیہ دیوان ہو گیا
زادِ سفر میں عشقِ نبی لے کے جب چلا
میرا سفر کٹھن تھا جو آسان ہو گیا
یوں میرے دل میں نشوونما اُس کی ہو گئی
عشقِ نبی جو گل تھا، گلستان ہو گیا
اے کاش! میرے خواب کی تعبیر ہو یہی
میں بھی درِ رسول کا دربان ہو گیا
اللہ کے حبیب کی مدحت کے وِرد سے
بے شک مری نجات کا سامان ہو گیا
لاریب اُسے بشارتِ جنت ملی نسیم
جو حرمتِ رسول پہ قربان ہو گیا

خواجہ غلام جیلانی عازمؔ/لاہور

یوں کسی روز میرے بخت سنواریں آ کے پھر نہ جائیں میرے آنگن سے بہاریں آ کے

والضحیٰ کا نور تو برسایئے، آ جایئے!
والقمر کی چاندنی بکھرایئے، آ جایئے!
مدتوں سے منتظر، آنکھیں کیے ہیں فرشِ راہ
جالیوں کو اک ذرا ، سرکایئے، آ جایئے!
جاں بہ لب ہیں ہجر میں آقا! کرم فرمایئے
دل بہ کف ہیں منتظر آ جایئے! آ جایئے
ہے سنا جب سے لحد میں آئیں گے ملنے حضورؐ
دل تو کہتا ہے ہمیں مر جایئے!۔۔ آ جایئے!
یوں تڑپنا ہر گھڑی ، اچھا نہیں دل کے لیے
آیئے، اس کو ہی کچھ سمجھایئے آ جایئے!
پھیکی پھیکی ہے ریاضِ خُلد کی ساری بہار
رونقِ باغِ جناں! مُسکایئے آ جایئے
عمرِ فانی کیا کریں؟ اے شمعِ نُورِ مبینؐ!
لو سے پروانے ، امر فرمایئے، آ جایئے!
ہم تو ہیں پابند و مجبور و گرفتار و اسیر!
اختیار اپنے ، عمل میں لایئے آ جایئے
آرزوئے دید کا مہتاب جوبن پر ہے آج
آج اُمید طرب ، بر لایئے، آ جایئے!
مہرِ فرقت کی تپش، جھلسا رہی ہے، قلب و جاں
بن کے بادل وصل کا، چھا جایئے، آ جایئے!
بھا گئی ہے گر مدینے کی سکونت، آپؐ کو
ساتھ ہی عازمؔ کو بھی لے جایئے آ جایئے!

گلابِ اُلفت کی آبیاری کو، نعت انؐ کی سنا رہا ہوں
ہر ایک دل میں ہے عشق ان کا، میں سویا شعلہ جگا رہا ہوں
مرا تو ہے ماننا کہ ہر شے، اُنہیؐ کی نسبت سے ہو تو اچھی
عمل کراماً لکھ رہے تھے، کتابِ مدحت لکھا رہا ہوں
دیارِ نوری کی ہیں فضائیں، کلاہ بطحا نگاہ میں ہے
نظارۂ گنبد و حرم کو، دل و نظر میں بسا رہا ہوں
درِ نبیؐ میرے سامنے ہے، یونہی نہیں اشک بار آنکھیں
ہے پیش کرنا درود ان کو، میں قمقموں سے سجا رہا ہوں
سلام کہنے کو جالیوں کے میں ہو رہا ہوں قریب جتنا
ہوا میں تحلیل ہو رہا ہوں، لطافتوں میں سما رہا ہوں
ہوں پیش دربار، دست بستہ تمازتِ قربِ محتشمؐ سے
میں قطرہ قطرہ، پگھل پگھل کے، وجود اپنا لٹا رہا ہوں
میں بابِ جبریل سے گزر کر، بطرفِ قدمین آ گیا ہوں
کمال احساسِ انسیت ہے، میں لمس قدموں کا پا رہا ہوں
متاعِ عشقِ نبیؐ مجھے تو ملا ہے میراث میں بڑوں سے
میری یہ اوقات کب تھی عازمؔ کمائی آباء کی کھا رہا ہوں

سب کے لیے ہے رات دن، بابِ کرم کھلا ہوا
کاسے لبالب، سب کے سب دامن ہر اک بھرا ہوا
چوکھٹ پہ جو بھی آ گیا ، دل کی مراد پا گیا
شاہ و گدا کہ نیک و بد ، کس کو نہیں عطا ہوا؟
آقا کو ڈھونڈنا کبھی اصحابؓ کو کٹھن نہ تھا
عرقِ بدن کا معجزہ طالب کا رہنما ہوا
رہنا وہاں پہ مستقل، مجھ کو تو نہ ہوا نصیب
صد شکر! اُن کو دے دیا ، دل کا تو کچھ بھلا ہوا
اپنا تو تھا ہی کچھ نہیں ، مال و متاع نہ قلب و جاں
انؐ پہ فدا کیا تو کیا ، اِن ہی کا تھا دیا ہوا
دو ہی طرح کے سر دِکھے، انؐ کے جلو میں سرفراز
تعظیم کو جھکا ہوا، ناموس پہ کٹا ہوا
فتحِ مبیں سے پیشتر ، دیکھا کسی نے تھا کبھی؟
جس کا علم بلند ہو ، اُس کا ہو سر جھکا ہوا
درگورگی کے دور میں بیٹی کی شان دیکھیے
شالہ جو زیبِ دوش تھا، قدموں میں ہے بچھا ہوا
مدح سرا حضورؐ نے ممبر پہ لا کھڑا کیا
اعزاز نعت گوئی کو آقاؐ سے ہے ملا ہوا
شہرِ تجلیات میں کوئی گیا جو با ادب
لوٹا ، بدن سے روح تک ، انوار سے اٹا ہوا
مرتا نہ کیسے میں بھلا؟ انؐ کے نگر میں دوستا!
میرے لیے تو حکم ہے ، سرکارؐ کا کہا ہوا
نظرِ کرم حضورؐ کی ، اس بے نوا پہ کیا ہوئی
عازمؔ سا ناسخن شناس، مدحت سے آشنا ہوا

یوں کسی روز میرے بخت سنواریں آ کے
پھر نہ جائیں میرے آنگن سے بہاریں آ کے
ہم گناہگاروں کو بھی اذن حضوری بخشیں
ہم بھی 'اُنظرنا' سرِ بزم پکاریں آ کے
گنبد و ممبر و محراب و ریاض و صُفہ
صحن و دالان و مواجہ کو نہاریں آ کے
ایک حسرت سی لیے پھرتے ہیں عشاقِ حزیں
جان و دل آپؐ کے قدموں پہ نثاریں آ کے
آپؐ نہ آئیں تو ڈر رہتا ہے ناراضی کا
ایسے وسواس کو للہ نکاریں آ کے
ناتواں ہے کہیں پس جائے نہ عازمؔ آقاؐ
بوجھ یہ ہجر کا کاندھے سے اُتاریں آ کے

تاریخی یومِ میلاد النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

جسٹس (ر) میاں نذیر اختر / لاہور

الحمد للہ ثم الحمد اللہ! میلاد النبی ﷺ کے مبارک مہینے ربیع الاول کا آغاز ہو گیا ہے۔ اس بار ۱۲ ربیع الاول ۱۴۴۷ھ (۶ ستمبر ۲۰۲۵ء) اس لحاظ سے انتہائی اہم اور تاریخی دن ہے کہ اس روز دنیا میں حضور نبی اکرم ﷺ کی آمد کو، قمری تقویم کے مطابق پندرہ سو برس مکمل ہو جائیں گے۔ اس مبارک موقع پر تمام مسلمان محافلِ میلاد، سیرتِ پاک کی محافل اور جلوسوں کا اہتمام کریں گے۔ یہ بات بہت حوصلہ افزا ہے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں اس تاریخی دن کو سرکاری سطح پر شایانِ شان طریقے پر منانے کا اعلان کیا گیا ہے۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم اس دور میں زندہ ہیں جب پندرہ سو برس بعد ہمیں عید میلاد النبی ﷺ کا تاریخی دن نصیب ہوگا۔ (ان شاء اللہ)۔

پندرہ سو برس پہلے حضور نبی اکرم ﷺ کی ولادتِ باسعادت کے ساتھ حیران کن معجزات، برکات اور اللہ تعالیٰ کے انعامات کا ظہور ہوا۔ آپ ﷺ کی والدہ ماجدہ نے مشاہدہ فرمایا کہ ”ولادت کے وقت میں نے محسوس کیا کہ ایک نور مجھ سے نکلا ہے جس سے شام کے محلات بھی روشن ہو گئے“۔ (الطبقات الکبریٰ ابن سعد: جلد ۱ ص ۱۰۲) ابن سعد کی دو اور روایتیں تھوڑے سے فرق سے بیان کی گئی ہیں۔ پہلی روایت یہ ہے کہ سیدہ آمنہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا ”میں نے دیکھا کہ مجھ سے ایک شہاب (شعلۂ نور) نکلا جس سے پوری زمین روشن ہو گئی“۔ دوسری روایت ان الفاظ میں ہے، ”اس نور کی وجہ سے شام کے محلات اور بازار روشن ہو گئے حتیٰ کہ میں نے بصرہ کے اُونٹوں کی گردنیں دیکھ لیں“۔ (ایضاً)۔ حضور نبی اکرم ﷺ کی والدہ محترمہ کا ایک اور مشاہدہ یہ تھا کہ ”میں نے آپ کی طرف نظر کی تو آپ ﷺ کو چودھویں رات کے چاند کی طرح پایا جس سے کستوری کی طرح خوشبو پھوٹ رہی تھی“۔ (شرح المواہب اللدنیہ، علامہ زرقانی، جلد ۴، ص ۲۲۳)۔

آمدِ مصطفیٰ ﷺ تخلیقِ کائنات سے بھی بہت بڑا اور عظیم الشان واقعہ ہے۔ اس کی غیر معمولی حیثیت کے کئی مظاہر رونما ہوئے، بحیرۂ ساوہ کا پانی خشک ہو گیا، کسریٰ کے محل میں زلزلہ آیا اور اس کے چودہ کنگرے گر گئے اور شرک کے قدیم مرکز فارس کے آتش کدہ کی آگ بجھ گئی، جو ایک ہزار برس سے مسلسل جل رہی تھی۔ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر المعروف امام جلال الدین سیوطی نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب ”الخصائص الکبریٰ“ میں مندرجہ بالا روایات زیر عنوان ”حضور ﷺ کے خصائصِ ولادت“ بیان کی ہیں۔ آپ ﷺ کی پیدائش کے سال میں اہلِ عرب اور قریش افلاس اور قحط کا شکار تھے لیکن آپ ﷺ کی ولادتِ مبارکہ کے ساتھ اللہ کریم کی کرم نوازیوں کا ظہور ہوا، ملکِ عرب میں ہر سُو بہار کا سماں ہو گیا، ویران زمینیں سرسبز ہو گئیں اور پورے ملک سے سختیاں اور کلفتیں دور ہو گئیں۔ اس ضمن میں علامہ احمد بن زینی دحلان (۱۲۳۲ھ تا ۱۳۰۴ھ) لکھتے ہیں: ”اس سال کا نام ہی فتح و مسرت کا سال پڑ گیا کیونکہ اس سے پہلے بنو قریش سخت قحط اور تنگی کا شکار تھے، پھر زمین سرسبز ہو گئی، درخت برگ و بار سے لد گئے اور اس سال ہر طرف خوب برق و باراں ہوئی“۔ (السیرۃ النبویہ: جلد ۱ ص ۴۵)

تاریخ شاہد ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ کے بچپن، لڑکپن، جوانی اور بعد کے ادوار میں آپ ﷺ سے حیران کن معجزات کا ظہور ہوا۔ علامہ جلال الدین سیوطی نے اپنی کتاب ”الخصائص الکبریٰ“ میں آپ ﷺ کے تقریباً ایک ہزار معجزات کا ذکر کیا ہے۔ آپ ﷺ نے دنیا کو توحید کا درس دیا اور اللہ کا دین لوگوں تک پہنچانے کے لیے زبردست جدوجہد کی، تکالیف برداشت کیں، کفار سے جنگ و جدل کی نوبت آئی جن میں اللہ کریم نے آپ ﷺ کو ہمیشہ سرخرو فرمایا۔ آپ ﷺ نے اپنی سیرت و کردار سے لوگوں کے قلوب کی دنیا بدل ڈالی، ایک روحانی انقلاب برپا فرمایا اور لوگوں کو دنیا و آخرت میں فوز و فلاح کا صراطِ مستقیم دکھایا۔ آج پوری دنیا میں تمام مفکرین اور دانشور تسلیم کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ ہی افضل البشر اور انسانی تاریخ کی عظیم ترین شخصیت ہیں۔ آپ ﷺ کی تعلیمات تمام ادیان کے مقابل اعلیٰ ترین، منصفانہ، عادلانہ اور عارفانہ ہیں۔ دینِ اسلام ہی انسانی مساوات اور معاشرتی امن و سکون کا پیامبر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام ہی دنیا میں سب سے زیادہ تیزی سے پھیلنے والا دین ہے۔

حضور نبی اکرم ﷺ سے سچی، غیر مشروط اور شدید محبت ہی مسلمانوں کے ایمان اور دین کی حقیقی روح ہے۔ مسلمان کائنات کے ہر مرکزِ مہر و محبت، نعمتوں اور رشتوں سے بڑھ کر حضور نبی اکرم ﷺ سے محبت کرتے ہیں۔ یہی سورۂ توبہ کی آیہ ۲۴ کا تقاضا ہے کہ مسلمان اپنے ماں، باپ، اولاد، ازواج، عزیز و اقارب، کاروبار، مال و دولت، اور مکانات سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ، اس کے رسول اور راہِ حق میں جہاد سے محبت کریں۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے بھی ارشاد فرمایا کہ تم میں کوئی مومن ہو ہی نہیں سکتا جب تک میں اسے اس کے ماں باپ، اولاد اور دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر محبوب نہ ہو جاؤں۔ محبت کرنے والوں کو حضور ﷺ نے یہ خوشخبری بھی سنائی کہ ”اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ“ یعنی (آخرت میں) بندہ اس کے ساتھ ہوگا جس سے وہ محبت کرتا ہے۔ صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین حضور ﷺ سے مخاطب ہوتے وقت، وفورِ محبت سے کہتے کہ حضور ﷺ ہمارے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان ہوں۔ اسی جذبۂ عشق و محبت کے طفیل مسلمانوں کو حضور ﷺ کا ادب و احترام اور خوش دلی سے اتباع

کرنے کی توفیق ملتی ہے۔ اسی کے باعث مسلمان حضور نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ مبارکہ، ان کی عزت وناموس اور عقیدۂ ختمِ نبوت کے دفاع کے لیے اپنی جانیں نثار کرتے ہیں۔ آج بھی یہی جذبہ مسلمانوں کی اصل طاقت وقوت ہے جس سے وہ اپنے سے زیادہ تعداد اور عسکری قوت رکھنے والے کفار سے ٹکرا کران کے منہ پھیر دیتے ہیں۔ دشمنانِ دین بھی اس بات سے آگاہ ہیں اور وہ مسلسل کوششیں کرتے رہتے ہیں کہ مسلمانوں سے روحِ محمد ﷺ یعنی عشقِ نبی سے سرشاری اور دین سے وابستگی کی روح کھینچ لی جائے۔ اسی حقیقت کی طرف حضرت علامہ اقبال نے اپنے اس شعر میں اشارہ فرمایا ہے:۔

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روحِ محمدؐ اس کے بدن سے نکال دو

اس روح کو زندہ وتابندہ رکھنے کے لیے ذکرِ مصطفیٰ ﷺ یعنی میلاد النبی ﷺ اور سیرت النبی ﷺ کی محافل کا اہتمام بہت اہم اور ضروری ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے اپنی پیدائش کے دن اور سارا سال اسے یاد رکھنے کی اہمیت کو اُمتِ مسلمہ پر واضح فرما دیا تھا۔ آپ ﷺ ہر پیر کو روزہ رکھتے اور صحابہ کرامؓ کے استفسار پر آپ ﷺ نے واضح فرمایا: ''یہ میری پیدائش کا دن ہے اور اسی دن مجھ پر وحی نازل ہوئی تھی''۔ صحابۂ کرام نے یہ سوال نہیں کیا کہ حضور ﷺ آپ کی پیدائش تو سال کے ایک دن یعنی ۱۲ ربیع الاوّل کو ہوئی تو ہر پیر کو روزہ رکھنے کا کیا جواز ہے؟ بلکہ صحابۂ کرامؓ نے آپ ﷺ کی اتباع میں خود بھی ہر پیر کو روزہ رکھنا شروع کر دیا۔ آج بھی عرب ممالک بالخصوص حرمین شریفین میں اکثر لوگ سوموار کو روزہ رکھتے ہیں۔ یہ اختیاری عمل مندوب یعنی مستحب ہے جو حُبِ نبوی ﷺ کا مظہر اور میلاد النبی ﷺ کے خصوصی اہتمام کا ایک انداز ہے۔ میلاد النبی ﷺ کے حوالے سے خوشی منانے کے لیے کسی خاص انداز یا ہیئت کو اختیار کرنے کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ اسے اختیاری رکھا گیا ہے جس کے لیے ہر جائز اور مباح طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ ذکرِ مصطفیٰ ﷺ کی محفلیں تو صحابہ کرامؓ کے گھروں اور مسجدِ نبوی ﷺ میں بھی ہوتی رہتی تھیں۔ ایک بار حضور نبی اکرم ﷺ چند صحابۂ کرامؓ کے ہمراہ، حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے گئے اور پوچھا کہ اے ابنِ عباسؓ اس وقت تم کیا کر رہے تھے؟ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میں اپنے گھر کے افراد اور بچوں کو آپ ﷺ کے بچپن کے واقعات سنا رہا تھا۔ یہ سن کر حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا، اچھا پھر سن لو کہ قیامت کے روز تمہارے لیے میری شفاعت واجب ہو گئی ہے۔ (الدرر المنظم فی مولد النبی زرقانی: ص ۹۵۔ التنویر فی مولد البشیر والنذیر۔ از مولانا ابو الخطاب الاندلسی)۔ حضرت ابو درداء فرماتے ہیں ''میں نبی اکرم ﷺ کے حضرت عامر انصاریؓ کے گھر گیا، وہ اپنے بیٹوں اور رشتے داروں کو واقعاتِ ولادتِ مصطفیٰ ﷺ کی تعلیم دے رہے تھے اور فرما رہے تھے یہی وہ دن ہے (جس دن حضور ﷺ کی پیدائش ہوئی) اس پر حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا، بے شک اللہ نے تمہارے لیے رحمت کے دروازے کھول دیئے ہیں اور تمام فرشتے تمہارے لیے دعائے مغفرت کر رہے ہیں، جو شخص تیری طرح یہ کام کرے گا، وہ تیری طرح نجات پائے گا''۔ (ایضا)۔ مسجدِ نبوی ﷺ میں بھی ذکرِ مصطفیٰ ﷺ کی محافل سجائی جاتی تھیں جن میں حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابۂ کرامؓ بھی آپ ﷺ کی شان میں قصائد (یعنی نعتیں) پڑھتے تھے اور آپ ﷺ قصائد پڑھنے والوں کے لیے دعا فرماتے تھے۔ بعد کے زمانوں میں ذکرِ مصطفیٰ ﷺ اور میلاد النبی ﷺ کی محافل کی ہیئت بدل گئی لیکن اصل جذبہ وہی ہے یعنی حضور نبی اکرم ﷺ کی محبت اور آپ ﷺ کی ولادت پر خوشی کا اظہار۔ یہ بہترین عمل ہی اللہ کریم کے حکم ''فلیفر حوا'' (پس خوش ہو جاؤ یا خوشی مناؤ) کا تقاضا ہے۔ محترم مولانا اشرف علی تھانوی نے بھی ذکرِ رسول ﷺ کی فضیلت کو یہ کہہ کر تسلیم کیا ''کیا حضور ﷺ کا ذکرِ مبارک ایسی چیز ہے کہ اس کی نسبت یہ سوال ہو سکے کہ اس وقت اس ذکر کو کیوں اختیار کیا گیا؟ حضور ﷺ کا ذکرِ مبارک تو ایسی چیز ہے کہ ہر وقت ہر انسان (مراد مسلمان) کے رگ وپے میں جاری وساری ہو بلکہ دوسرے اذکار بھی اسی ذکر کی طرف راجع ہو جایا کریں اور اس کو ہم نے خود مشاہدہ کیا ہے کہ جس سے محبت ہوتی ہے، انسان ہر ذکر سے اسی کا ذکر نکال لیتا ہے اور ہر گفتگو کا خاتمہ اس کے تذکرہ اور یاد پر ہوتا ہے''۔ (مواعظِ میلاد النبی ﷺ۔ مولانا اشرف علی تھانوی، ۱۳۔ جمیلی کتب خانہ طبع ۱۹۸۱)۔ انہوں نے اس حدیثِ پاک کا حوالہ دیا ''مَنْ اَحَبَّ شَيْئًا اَكْثَرَ ذِكْرَهٗ'' (جو کسی شے سے محبت کرتا ہے تو کثرت سے اس کا ذکر کرتا ہے)۔ محترم تھانوی صاحب فرح بہ ولادتِ نبی کریم ﷺ کی ایک دن تحدید کے حق میں نہیں بلکہ سارا سال خوشی منانے کے قائل ہیں۔ بہر حال وہ ایسی محافلِ میلاد جن میں منہیات یعنی غیر مناسب حرکات کا ارتکاب کیا جائے کو بدعہ واجب الترک کہتے ہیں۔

اسلامی تعلیمات کا صحیح علم وشعور رکھنے والے مسلمان، علمائے اُمت، اولیائے کرام اور مشائخ عظام میلاد النبی ﷺ کو عید کی طرح منانے کا اہتمام کرتے ہیں اور یوں آمدِ مصطفیٰ ﷺ پر اپنی دلی خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ چشمِ بینا رکھنے والے مسلمان تو بلا تشکیک یہ کہتے ہیں:۔

عیدین کی دولت بھی ملی ان کی بدولت
میلاد النبیؐ عید ہے ہر عید سے بڑھ کر

حضور نبی اکرم ﷺ ہی کائنات میں اللہ کا سب سے بڑا فضل اور رحمت ہیں۔ قرآنِ پاک میں اللہ کریم کا فرمان ہے:۔ ''قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ۔۔۔'' (آپ کہہ دیں کہ اللہ کے فضل اور اس کی رحمت پر، پس چاہیے کہ اس پر خوشی منائیں۔ سورۂ یونس: آیت، ۵۸)۔ اس آیۂ مبارکہ کے حوالے سے حضرت پیر کرم شاہ الازہری لکھتے ہیں: ''اُمتِ

اسلامیہ صدیوں سے اللہ تعالیٰ کی اس نعمتِ عظمیٰ پر اپنے جذبات تشکر وامتنان کا اظہار کرتی رہی ہے۔ ہر سال ہر اسلامی ملک کے ہر چھوٹے بڑے گاؤں اور شہر میں عید میلاد النبی ﷺ منانے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ ان راتوں اور ان دنوں میں ذکر وفکر کی محفلیں منعقد کی جاتی ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کی شانِ کبریائی اور اس کے محبوبِ مکرم، شفیع المذنبین کی شانِ رفعت ودلربائی کے تذکرے کیے جاتے ہیں۔ سامعین کو اس دینِ قیم کے احکامات سے آگاہ کیا جاتا ہے۔ علما تقریریں کرتے ہیں۔ ادباء مقالے پڑھتے ہیں، شعرا اپنے منظوم کلام سے اظہارِ عقیدت ومحبت کرتے ہیں، صلاۃ وسلام کی روح پرور صداؤں سے ساری فضا معطر اور منور ہو جاتی ہے، اہلِ خیر کھانے پکا کر غربا اور مساکین میں تقسیم کرتے ہیں۔ صدقات وخیرات سے ضرورت مندوں کی جھولیاں بھر دیتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ گلشن اسلام میں از سرِ نو بہار آ گئی ہے"۔ (ضیاء النبی از پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ۔ ج ۲ ص ۴۶، ۴۷)۔ محقق العصر حضرت مفتی محمد خان قادریؒ (بانی: جامعہ اسلامیہ لاہور) نے محولہ بالا آیتِ مبارکہ "قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا" کا مفہوم ان الفاظ میں بیان کیا ہے: "ان ارشاداتِ ربانی نے واضح طور پر یہ اُصول دے دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہر فضل ورحمت کے حصول پر فرحت وخوشی کے اظہار کا حکم ہے مثلاً قرآن واسلام بلکہ ہر خیر، اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جس پر جتنی بھی خوشی کا اظہار کیا جائے کم ہے چونکہ حضور ﷺ کی ذات تمام مخلوق پر اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی مہربانی، فضل بلکہ فضل ورحمت کا واسطہ اور سرچشمہ ہے۔ اس لیے آپ ﷺ کی آمد پر ان تمام سے بڑھ کر مومن کو خوشیاں منانی چاہییں اور محفلِ میلاد اجتماعی طور پر اسی خوشی کے اظہار کی ایک صورت ہے۔۔۔" (محفلِ میلاد پر اعتراضات کا علمی محاسبہ۔ ص ۳۰۔ از مفتی محمد خان قادری: کاروان اسلام پبلی کیشنز)۔ محترم مفتی صاحب مزید فرماتے ہیں:

"۔۔۔آپ ﷺ کا یومِ ولادت تمام ایام سے عظیم تر ہے۔ کوئی جمعہ اور عید اس کے ہم پلہ نہیں۔ اگر ہم اس عظمت کا لحاظ کریں تو لفظ "عید" بھی اس کے شایانِ شان نہیں۔ کیونکہ اس سے بڑھ کر ہمارے پاس کوئی لفظ نہیں۔ لہٰذا عید کا ہی اطلاق کر دیتے ہیں"۔ (ایضاً: ص ۱۶۲)۔ مولانا ابو الکلام آزاد ربیع الاول کے جشنِ میلاد کے حوالے سے لکھتے ہیں: "۔۔۔ماہ ربیع الاول کا ورود تمہارے لیے جشن ومسرت کا ایک پیغام عام ہوتا ہے کیونکہ تم کو یاد آ جاتا ہے کہ اسی مہینے کے ابتدائی ہفتوں میں خدا کی رحمتِ عام کا دنیا میں ظہور ہوا۔ اسلام کے داعیِ برحق کی طرف سے دنیا کی دائمی غمگینیاں اور سرگشتگیاں ختم کی گئیں۔ صلی اللہ علیہ وآلہ وصحبہ وسلم، تم خوشیوں اور مسرتوں کے ولولوں سے معمور ہو جاتے ہو۔ تمہارے اندر خدا کے رسولِ برحق ﷺ کی محبت وشیفتگی ایک بے خودانہ جوش ومحویت پیدا کر دیتی ہے۔ تم اپنا زیادہ سے زیادہ وقت اسی کی یاد میں، اسی کے تذکرے میں اور اسی محبت کے لذت وسرور میں بسر کرنا چاہتے ہو۔۔۔ پس کیا مبارک ہیں وہ دل جنہوں نے اپنے عشق وشیفتگی کے لیے رب السمٰوات والارض کے محبوب کو چنا اور کیا پاک ومطہر ہیں وہ زبانیں جو سید المرسلین ورحمۃ للعالمین ﷺ کی مدح وثنا میں زمزمہ سنج ہوئیں۔۔۔ انہوں نے اپنے عشق وشیفتگی کے لیے اس کی محبوبیت کو دیکھا جسے خُود خدا نے اپنی چاہتوں اور محبتوں سے ممتاز کیا اور ان کی زبانوں نے اس کی مدح وثنا کی جس کی مدح وثنا میں خود خدا کی زبان، اس کے ملائکہ اور قدوسیوں کی زبان اور کائناتِ ارض کی تمام پاک روحوں اور سعید ہستیوں کی زبان ان کی شریک وہمنوا ہے۔۔۔ اس کی یاد میں جتنی گھڑیاں بھی کٹ جائیں، اس کے عشق میں جتنے آنسو بھی بہہ جائیں، اس کی محبت میں جتنی آہیں بھی نکل جائیں اور اس کی مدح وثنا میں جس قدر بھی زبانیں زمزمہ پیرا ہوں، انسانیت کا حاصل روح کی سعادت، دل کی طہارت، زندگی کی پاکی اور ربانیت والٰہیت کی یاد شاہی ہے"۔ (سیرت النبی ﷺ از ابو الکلام آزاد: ص ۶۴ تا ۶۷)۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے اپنے ایک خطبے میں واضح فرمایا کہ حضور نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ مبارکہ ہی اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا فضل اور رحمت ہیں۔ لہٰذا ان کی نسبت جس قدر بھی خوشی وفرحت کا اظہار کیا جائے، وہ بھی کم ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ "حضور ﷺ کا وجودِ باجود اصل ہے تمام نعمتوں کی اور مادہ ہے تمام رحمتوں اور فضل کا پس یہ تفسیر "اجمع التفاسیر" ہو جائے گی۔ پس اس تفسیر کی بنا پر حاصل آیت کا یہ ہوگا کہ ہمیں حق تعالیٰ ارشاد فرما رہے ہیں کہ حضور ﷺ کے وجود باجود پر خواہ وجودِ نوری ہو یا ولادتِ ظاہری اس پر خوش ہونا چاہیے۔ غرض اصل الاصول تمام موادِ فضل ورحمت کی حضور ﷺ کی ذاتِ بابرکت ہوئی۔ پس ایسی ذاتِ بابرکات کے وجود پر جس قدر بھی خوشی اور فرح ہو، کم ہے۔ بہر حال اس آیت سے عموماً وخصوصاً ثابت ہوا کہ اس نعمتِ عظیمہ پر خوش ہونا چاہیے"۔ (مواعظ عید میلاد النبی ﷺ، از مولانا اشرف علی تھانوی، ص ۱۲۰، ۱۲۱۔ ایڈیشن ۱۹۸۱ء، کتب خانہ جمیلی ۸۰ ڈی ماڈل ٹاؤن لاہور۔ بمطابق جدید ایڈیشن خطابت حکیم الامت مطبوعہ اپریل ۲۰۲۰ء، ادارہ تعلیماتِ اشرفیہ، ملتان، جلد ۵ ص ۶۸، ۶۹)

خوشی کا قلبی وروحانی جذبہ اور احساس ظاہری اور خارجی اظہار کا متقاضی ہوتا ہے جس کے لیے ہر معروف، جائز اور مباح طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے جیسے ایک دوسرے کو مبارک باد کہنا، اچھے کپڑے پہننا، اچھے کھانے پکا کر اپنے اہلِ خانہ، احباب اور غریب غربا کو کھلانا، چراغاں کرنا، میلاد کی محافل کا اہتمام کرنا وغیرہ۔ چھٹی صدی ہجری کے مشہور محدث ابن جوزیؒ (۵۱۰ھ تا ۵۷۹ھ / ۱۱۱۶ء / ۱۲۱۰ء) نے اپنی کتاب "مولد النبی ﷺ" (میلاد النبی ﷺ) میں لکھا ہے: "عرب کے شرق وغرب، مصر وشام اور تمام آبادی اہلِ اسلام نے بالخصوص حرمین شریفین میں مولد النبی ﷺ کی مجالس منعقد ہوتی ہیں۔ ماہ ربیع الاول کا ہلال دیکھتے ہی خوشیاں کرتے ہیں۔ قیمتی کپڑے پہنتے

ہیں۔ قسم قسم کی زینت کا اظہار کرتے ہیں۔ خوشبو لگاتے ہیں۔ سرمہ لگاتے ہیں اور ان دنوں میں خوشیاں مناتے ہیں اور میلاد النبی ﷺ سنتے ہی بڑی سعی بلیغ کو کام میں لاتے ہیں تو اس کے عوض میں خدا کی طرف سے بڑی کامیابی اور خیر و برکت حاصل کرتے ہیں اور یہ تجربہ شدہ عمل ہے کہ ان دنوں میں کثرت سے خیر و برکت پائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ سلامتی و عافیت، رزق میں وسعت، مال کی زیادتی، مال و دولت میں ترقی، امن و امان تمام ملک میں پایا جاتا ہے اور تمام گھروں میں سکون اور آرام حاصل ہوتا ہے۔ رسولِ خدا کے صدقے یہ سب کچھ حاصل ہوتا ہے۔" (مولد النبی ﷺ: ص ۵۸)۔ امام جلال الدین سیوطیؒ عظیم عالم دین اور روحانی شخصیت ہیں جنہیں ستر مرتبہ ظاہری طور پر حضور ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی۔ وہ میلاد النبی ﷺ کا اہتمام کرنے کو بہت پسند فرماتے ہیں۔ وہ اپنی کتاب "احسن المقصد فی عمل المولد فی الحاوی للفتاویٰ" (جلد ۱ ص ۱۸۹) میں فرماتے ہیں:۔ "مولد النبی ﷺ کی اصل لوگوں کا اجتماع ہے۔ جس میں قرآنِ پاک کی تلاوت جتنی سہل ہو، روایات اور آیات متعلقہ ولادتِ نبوی ﷺ کا دہرانا، اس کے بعد کھانا تقسیم کرنا اور دستر خوان پر خود بیٹھ کر کھانا ہوتا ہے۔ میرے نزدیک یہ ان نو ایجاد اُمور میں سے ہے کہ جن پر عمل کرنے والوں کو ثواب ملتا ہے کیونکہ مجلسِ میلاد میں حضور ﷺ کا اعزاز اور تعظیم اور آپ ﷺ کی پیدائش پر اظہارِ مسرّت کیا جاتا ہے"۔ ابو الشامہ اُستاذ الحدیث امام نوویؒ (شارح مسلم شریف) فرماتے ہیں:۔ "ہمارے زمانے میں جو بہترین نیا کام کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ لوگ ہر سال حضور ﷺ کے میلاد کے دن صدقات اور خیرات کرتے ہیں اور اظہارِ مسرّت کے لیے گھروں اور کوچوں کو آراستہ کرتے ہیں کیونکہ اس میں کئی فائدے ہیں۔ فقرا و مساکین کے ساتھ احسان اور مروّت کا برتاؤ ہوتا ہے۔ نیز جو شخص یہ کام کرتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دل میں حضور ﷺ کی محبت اور تعظیم ہے اور وہ شکر گزار ہے اللہ تعالیٰ کے اس احسان پر کہ اس نے حضور ﷺ کو رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا"۔ (السیرت الحلبیہ: جلد ۱۔ ص ۸۰)۔ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی (۱۲۳۳ھ تا ۱۳۱۷ھ) کا شمار ان عظیم علمی اور روحانی شخصیات میں ہوتا ہے جن کی عزت و تکریم ہر مسلک کی پیروی کرنے والے مسلمان کرتے ہیں، فرماتے ہیں: "فقیر کا مشرب یہ ہے کہ محفلِ مولود میں شریک ہوتا ہوں بلکہ برکات کا ذریعہ سمجھ کر ہر سال منعقد کرتا ہوں اور قیام میں لطف اور عظمت پاتا ہوں"۔ (فیصلہ ہفت مسئلہ: ص ۲۱۔ از حاجی مہاجر امداد اللہ مکی)۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ محفلِ میلاد النبی ﷺ کا اہتمام کرنے اور اس میں شریک ہونے کو درست اور باعثِ خیر و برکت سمجھتے تھے۔ وہ اپنا ایک مشاہدہ ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں:۔ "اس سے پہلے میں مکہ معظمہ میں نبی ﷺ کے مقامِ ولادت پر حاضر ہوا تھا۔ یہ دن آپ ﷺ کی ولادت مبارک کا دن تھا اور لوگ وہاں جمع تھے اور آپ ﷺ پر درود و سلام بھیج رہے تھے اور آپ ﷺ کی ولادت پر آپ ﷺ کی بعثت سے پہلے جو معجزات اور خوارق ظاہر ہوئے تھے، ان کا ذکر کر رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ اس موقع پر یکبارگی انوار روشن ہوئے۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ ان انوار کو میں نے جسم کی آنکھ سے دیکھا یا اُن کا روح کی آنکھ سے مشاہدہ کیا۔ بہرحال اس معاملہ کو صرف اللہ ہی جانتا ہے کہ جسم کی آنکھ اور روح کی آنکھ کے بین بین کونسی حس تھی جس سے میں نے ان انوار کو دیکھا۔ پھر میں نے ان انوار پر مزید توجہ کی تو مجھے ان فرشتوں کا فیض اثر نظر آیا جو اس قسم کے مقامات اور اس نوع کی مجالس پر مؤکل ہوتے ہیں۔ الغرض اس مقام پر میں نے دیکھا کہ فرشتوں کے انوار، انوارِ رحمت سے خلط ملط ہیں"۔ (فیوض الحرمین۔ ترجمہ پروفیسر محمد سرور: ص ۱۱۵۔ دار الاشاعت اردو بازار کراچی)۔ حضرت شاہ ولی اللہ کے والد محترم حضرت شاہ عبدالرحیمؒ فرماتے ہیں:۔ "میں ہر سال حضور ﷺ کے میلاد کے موقع پر کھانے کا اہتمام کرتا تھا لیکن ایک سال کھانے کا اہتمام نہ کر سکا مگر میں نے بھنے ہوئے چنے لے کر لوگوں میں تقسیم کر دیئے۔ رات کو میں نے خواب میں دیکھا کہ حضور ﷺ کے سامنے وہی چنے رکھے ہوئے ہیں اور آپ ﷺ بہت خوش و خرم ہیں"۔ (الدر الثمین۔ شاہ ولی اللہ: ص ۴۰)۔ نواب صدیق حسن خان بھوپالی نے محفلِ میلاد کے انعقاد کے بارے میں لکھا: "۔۔۔اس میں کیا بُرائی ہے۔ اگر ہر روز ذکر حضرت ﷺ نہیں کر سکتے تو ہر اسبوع یا ہر ماہ میں التزام اس کا کر لیں کہ کسی نہ کسی دن بیٹھ کر ذکر یا وعظِ سیرت و سمت و دل وھدئی و آنحضرت ﷺ کا کریں۔ پھر ایام ماہ ربیع الاوّل کو بھی خالی نہ چھوڑیں اور ان روایات و اخبار و آثار کو پڑھیں، پڑھائیں جو صحیح طور پر ثابت ہیں"۔ (الشمامۃ العنبریہ من خیر المولد البریہ: ص ۵)۔ انہوں نے مزید لکھا "جس کو حضرت ﷺ کے میلاد کا حال سن کر فرحت حاصل نہ ہو اور فضل خدا کے حصول پر اس نعمت کا شکر ادا نہ کرے وہ مسلمان نہیں۔ (ایضاً: ص ۱۲)۔ دیگر بے شمار علمائے اسلام، مشائخِ عظام اور اہم روحانی ہستیاں محافلِ میلاد، جو منہیات سے پاک ہوں، کے زبردست حامی اور موید ہیں۔ اسی طرح میلادِ النبی ﷺ کی خوشی میں ایسے جلوس بھی باعثِ خیر و برکت ہیں جن میں درود و سلام اور اچھی نعتوں کا اہتمام کیا جائے، نعتیں فلمی گانوں کی طرز پر نہ پڑھی جائیں اور اس بات کا خیال رکھا جائے کہ کوئی فرض نماز قضا نہ ہونے پائے۔ عید میلاد النبی ﷺ کا اہتمام کرنا اور جائز طریق پر خوشیاں منانا برحق، حکمِ الٰہی "فلیفرحوا" کا تقاضا اور باعثِ خیر و برکت ہے لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہم حضور نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات کو اپنائیں، اپنے جملہ دینی فرائض کو بطریق احسن پورا کریں، حضور ﷺ کی سیرت و کردار سے روشنی حاصل کر کے اپنے کردار کو سنواریں اور تا زیست صراطِ مستقیم پر گامزن رہیں۔

CS CamScanner

شہید حکیم محمد سعیدؒ سے وابستہ کچھ یادیں

غالب عرفان

میری زندگی کا وہ دن شاید غمگین ترین دنوں میں سے ایک دن تھا جس دن گیارہ بجے میرے ایک شناسا نے دفتر میں فون پر مجھے اطلاع دی کہ حکیم محمد سعید آج صبح صبح قتل کر دیے گئے۔ یہ خبر اتنی غیر متوقع تھی کہ چند لمحے تک میں سکتے میں آ گیا اور مجھے یوں لگا جیسے میرا کوئی بہت ہی قریبی عزیز مجھ سے بچھڑ گیا ہو۔ وہ دن ۱۷؍اکتوبر ۱۹۹۸ء کا منحوس دن تھا اور آج ۱۷ برس بیت جانے کے بعد بھی میرے ہوش وحواس پر کچھ اس طرح مسلط ہے جیسے یہ کل ہی کی بات ہو۔

عالم اسلام کا ہی نہیں طب کی دُنیا کا یہ عظیم نقصان ایسا نہیں کہ جلد ہی اس کی تلافی ہو سکے۔ حکیم محمد سعید کو آج بھی مرحوم لکھنے کو جی نہیں مانتا۔ وہ ایک ایسی زندہ جاوید شخصیت تھیں جنھوں نے یونانی طب اور چینی طب پر ہی تحقیق کے نئے در وا کیے بلکہ ایلوپیتھی طریقہ علاج میں بھی جدید ڈھنگ سے سوچا اور قدرت کے بے پایاں خزانہ فطرت سے انسانی امراض کو ختم کرنے کے نئے نسخہ ہائے بے بہا دریافت کیے۔ تجربات کیے، مسیحائی کے نئے چراغ روشن کیے۔ یہی نہیں اُن کا ذہن جس نے وراثت میں طبی صلاحیتیں پائی تھیں اُس نے اسلامی اصولوں اور تعلیمات کی روشنی میں اخلاق و اقدار کی پاسداری سے معاشرے میں مثبت رویوں کی نشاندہی کی۔ وہ بذاتِ خود تن من دھن سے نسلِ آئندہ کی کردار سازی میں مصروف رہے۔ اُن کی سوچ میں ایک بنیادی عنصر جو انہیں، ہم عصروں سے الگ کرتا ہے وہ ہے تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت کی اہمیت! ایسی بلندیِ کردار کا حامل انسان، اب کہاں؟ شاید ایسی ہی کسی جگہ علامہ اقبال نے فرمایا تھا:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

میں بذاتِ خود عقیدت کی حد تک اُن کا نیاز مند رہا۔ وہ مجھ پر ہمیشہ شفقت سے پیش آتے رہے۔ ''شام ہمدرد'' کی شاید ہی کوئی ایسی تقریب ہو جس کے لیے مجھے دعوت نامہ نہ ملا ہو یا پھر شاید ہی ایسی کوئی ہمدرد کی شام ہو جس میں، میں نے حاضری نہ دی ہو۔

ایک زمانے میں ایک عرصے تک پاکستان کے تمام بڑے شہروں کراچی، اسلام آباد، لاہور، راولپنڈی، پشاور اور کوئٹہ میں ہر ماہ یہ شام منعقد ہوا کرتی تھی۔ لہٰذا اس سلسلے میں میرا یہ دہرانا عجیب سا لگے گا کہ اُن تاریخی جلسوں میں اُس عہد کے سلگتے ہوئے مسائل موضوعِ بحث ہوتے تھے جنھیں قوم کے مشاہیر، دانشور اور مثبت سوچ کے حامل مدبر اپنے اظہارِ خیال سے نوازا کرتے۔ ایسی ہی ایک شام کا جسے انھوں نے سیمینار کا عنوان دیا تھا وہ نونہالانِ وطن کے مستقبل سے وابستہ تھا۔ اس سیمینار میں شرکا نے انتہائی قیمتی مشوروں سے سامعین و حاضرین کو بہرہ مند کیا تھا۔

ایسی تمام محفلیں نہایت ہی باوقار ہوٹلوں میں برپا ہوا کرتیں جن کا اختتام پرتکلف چائے یا گراں قدر عشائیوں پر انجام پاتا تھا۔ ایسی ہی شاموں کے تسلسل میں ایک خوبصورت روایت در آئی تھی جسے ''وثیقۂ اعتراف'' کا نام دیا گیا تھا۔ یہ تقریبات بھی باری باری ہر شہر کی منتخب علمی، ادبی و سماجی ہستیوں کو اُن کی طویل خدمات کے صلے میں ''ہمدرد'' کی جانب سے قومی ہیروز کے اعتراف کی اعلیٰ مثالیں قائم کر گئیں۔ ایسی شخصیتوں کا انتخاب بھی ایسے پینل کے ذریعے ہوتا تھا جن کی غیر جانب داری اور مدبرانہ صلاحیت مسلم ہوتی تھی۔ ایسی ہی ایک ''وثیقۂ اعتراف'' کی تقریب جو ریجنٹ پلازا میں منعقد ہوئی تھی اس کی صدارت اُس وقت کے اکادمی ادبیات کے چیئرمین افتخار عارف کر رہے تھے۔ اُس میں شہر کی اہم شخصیتیں موجود تھیں جن میں مہتاب اکبر راشدی نے بھی اظہارِ خیال کیا تھا۔ تقریر کے اختتام پر حکیم محمد سعید کا یہ فقرہ بھی نوٹ کیجیے ''میں دلّی کا رہنے والا ہوں اور دلّی والوں کو لوگ اہلِ زبان کہتے ہیں مگر آج محترمہ کی زبان کی شائستگی روانی، تلفظ کی ادائیگی اور شگفتگی کو دیکھ کر میں نے جانا کہ فصاحت اور بلاغت کسے کہتے ہیں۔ یہ صلاحیت وخاصیت کسی کی میراث نہیں ہوتی!''

''مدینۃ الحکمت'' (ہمدرد یونیورسٹی) کے قیام کے بعد ایک مرتبہ مجھے اُس کے تفصیلی دورے کا شرف حاصل ہوا تھا جو میرے مرحوم دوست وہاب صدیقی (جو اُن دنوں وہاں شعبۂ تعلقاتِ عامہ کے سربراہ تھے) نے ممکن بنایا تھا۔ یہ مرحوم وہاب صدیقی بھی مرحومہ فوزیہ وہاب (پی پی پی) کے پہلے خاوند تھے۔

بہرحال یہ ۱۹۹۲ء کی بات ہے۔ اس زمانے میں ہفتے میں دو بار ہمدرد سنٹر (ناظم آباد) سے صبح ۱۰ بجے ایک بس اُن لوگوں کو جو مدینۃ الحکمت کا دورہ کرنا چاہتے، لے کر نکلتی پھر وہاں کے چپے چپے کی سیر کرنے کے لیے انہیں چھوڑ دیتی اور شام کو ۴ بجے واپسی کا سفر اختیار کرتی۔ اس دوران ہمدرد کا ہی ایک افسر رہنمائی کے لیے آنے والوں کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔ اس روز ہماری خوش قسمتی کہ مرحوم حکیم سعید بھی ہمارے استقبال کو وہاں موجود تھے۔ انھوں نے بہ نفسِ نفیس ہمیں اپنے ساتھ لے کر اس وسیع و عریض مرکزِ علم و حکمت کا گوشہ گوشہ روشن کروایا تھا۔ ایک بہت بڑا کتب خانہ جس میں قدیم ترین مخطوطات، کتابیں، قلمی نسخے، اخبارات کے تراشے اور وہ صحیفے جنھوں نے تاریخ عالم میں مرکزی کردار ادا کیا تھا، سب کچھ موجود تھے۔ ہم اُن نوادر اور قلمی نسخوں کو دیکھ کر اُس گراں قدر سرمایہ بے بدل کے تحفظ پر دل ہی دل میں حکیم صاحب کی علم سے محبت کے حد درجہ قائل ہو رہے تھے۔ وہاں قریب کی عمارت کی اُوپری منزل میں کچھ کمرے خوبصورتی کی مثال بنے رہائشی سہولتوں کے ساتھ موجود تھے۔ مرحوم حکیم صاحب نے ہمیں بتایا کہ یہ کمرے بالخصوص، اُن محققین کے لیے مختص ہیں، جنھیں لائبریری سے استفادہ کی صورت میں قیام کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسی شخصیتوں کو طعام و قیام کی سہولت ہمدرد ہی بے مول فراہم کرتا ہے۔ سیر کرتے ہوئے ہم واپس نیچے ہمدرد پبلک اسکول پہنچے تو وہاں پہلی جماعت سے ساتویں جماعت تک کے بچے ہمارے استقبال کے لیے کھڑے موجود نظر آئے۔ حکیم صاحب نے ان

بچوں سے ملواتے ہوئے جو کچھ کہا وہ میں اپنی یادداشت کے حوالے سے یہاں پیش کر رہا ہوں:

”دیکھیے جناب! یہ بچے ہی مستقبل کا پاکستان ہیں۔ یہاں ہم پورے پاکستان کے ہر علاقے سے بچوں کو منتخب کر کے لاتے ہیں جن میں زبان، نسل، ذات برادری یا قبیلے کی کوئی تخصیص نہیں ہوتی۔ ہم یہاں اُن کی صرف تعلیم ہی نہیں تربیت کے بھی ذمہ دار ہیں۔ یہ بچے یہاں سے اپنی تعلیم کے ساتھ ساتھ اخلاقی تربیت بھی حاصل کر کے نکلیں گے تو آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان سے زیادہ شائستہ، مہذب اور پاکستان کا دردمند کون ہوگا؟“

وہ تاحیات اسلام کے بنیادی اصولوں کے مطابق تعلیم کے ساتھ تربیت کی اہمیت پر زور دیتے رہے۔ اخبارات میں اپنی تحریروں کے ذریعے اور ہمدرد اجتماعات کے علاوہ جہاں کہیں بھی مدعو کیے جاتے اپنی تقریروں کے ذریعے ان کا زور اخلاق پر ہوتا تھا جن میں اخلاق کے وہی اصول بتلاتے تھے جس کی بنیاد سرورِ کائنات نے آج سے چودہ سو سال پہلے رکھ دی تھی۔ اس وقت میرے شعور میں یادوں کی ایک کہکشاں جگمگا رہی ہے اور میرے لیے یہ ممکن نہیں کہ اُن سے وابستہ یادوں کو مرحلہ وار ترتیب دے سکوں۔ جیسے جیسے کوئی اہم بات یاد آتی جائے گی سپردِ قلم کرتے جاؤں گا۔ پھر دوسرا خدشہ یہ بھی ہے کہ تحریر طوالت کا شکار ہو کر مقصدِ تحریر کو ہی نہ دُھندلا دے۔

اُن کو گورنر سندھ کا عہدہ تفویض کیے جانے سے پہلے کی بات ہے میں اپنی بیٹی کی شادی کا دعوت نامہ لے کر ہمدرد سنٹر پہنچا کہ بذاتِ خود انہیں پیش کر کے تقریب میں اُن کی شرکت کی توثیق کرالوں۔ اُن کے ڈائریکٹر تصویر حسین حمیدی سے ملاقات ہوئی جو مجھے پہلے سے جانتے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ صدرِ مملکت غلام اسحاق خان نے کراچی پہنچتے ہی اُن کو اپنے معمول کے مطابق ایوانِ صدر طلب کر لیا ہے۔ لہٰذا اب جلد ہی اُن کی واپسی کا امکان نہیں! میں نے دعوت نامہ اُن کے حوالے کیا اور تاکید کی حکیم صاحب سے میری بات ضرور کروا دیں۔ اگلے روز انھوں نے فون کر کے پہلے تو دعوت نامے کا شکریہ ادا کیا پھر وعدہ کیا کہ اگر کراچی میں رہے تو ضرور شرکت کریں گے۔ ساتھ ہی اگلے لمحے انھوں نے شادی ہال کا محل وقوع بھی معلوم کر لیا لیکن برا ہو اُن کی مصروفیتوں کا جس کے سبب وہ اُس روز شہر سے باہر تھے۔ بہرحال اُن کی تحریری مبارک باد بعد میں مجھ تک پہنچ گئی تھی۔ اُن کی شرافت، دیانتداری اور منصف مزاجی کے سبب انھیں سابق صدر مرحوم غلام اسحاق خان اس حد تک پسند کرتے تھے کہ انھیں اپنے عہد صدارت میں سندھ کا گورنر مقرر کر دیا تھا۔ یہ خوش خبری کراچی کے ہی نہیں پورے ملک کے تعلیم یافتہ سنجیدہ طبقے کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ کی طرح نازل ہوئی تو میں نے اس خوش آئند تبدیلی کو سراہتے ہوئے انھیں مبارک باد کا ایک خط لکھا جس کا جواب انھوں نے اپنے انکسارانہ شکریے کے ساتھ مجھے تحریر کر دیا۔

یہ بھی نوے کی دہائی کی بات ہے کہ جب مولانا صلاح الدین مرحوم (مدیر ”تکبیر“) اپنے نجی دورے پر فرانس گئے تو مشہور اسکالر اور قرآن کے فرانسیسی زبان کے مترجم پروفیسر ڈاکٹر حمید اللہ (مرحوم) سے مل کر انھیں پاکستان آنے کی دعوت دی تھی۔ مجھے یاد ہے جب پروفیسر صاحب کراچی تشریف لائے تو مولانا صلاح الدین کی ایما پر ہی حکیم صاحب نے اُن کے اعزاز میں مدینۃ الحکمت کے وسیع و عریض ہال میں ایک عظیم جلسے کا اہتمام کیا تھا جس کی صدارت جامع کراچی کے اُس وقت کے شیخ الجامعہ پروفیسر ڈاکٹر اوتفاق علی نے کی تھی۔ میں یہاں اس واقعہ کا ذکر برسبیل تذکرہ نہیں کر رہا ہوں۔ بلکہ اُس روز مجھے حکیم صاحب کی ایک اور خوبی کا علم ہوا تھا۔ مغرب کی نماز کے بعد جب شرکا کو چائے پیش کی گئی تو اُن کے چپراسی نے فوراً شربت (روح افزا) کا ایک ٹھنڈا گلاس انہیں پیش کیا۔ میں نے استفہامیہ نظروں سے تصویر حسین حمیدی کی طرف دیکھا تو انھوں نے بتایا کہ وہ بلاناغہ روزہ رکھتے ہیں اور اسی طرح ایک گلاس شربت سے افطار کرنے کے بعد اپنی رہائش گاہ پہنچ کر رات کا کھانا تناول فرماتے ہیں۔ یہی زندگی بھر ان کا معمول رہا اور اسی کی وہ ہمیشہ تلقین کیا کرتے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ انسان کو صحت بخش زندگی گزارنے کے لیے صرف صبح کا بھرپور ناشتہ اور مغرب کی نماز کے بعد معمول کا کھانا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں اکثر ان کے مضامین اخبارات و رسائل کی زینت بنے رہے۔

انھوں نے کئی بار چین کا سفر کیا اور ہمیشہ طب کے میدان میں نہ صرف چین کی صدیوں پرانی تحقیق کو اپنے ساتھ ملانے کا جتن کیا بلکہ اس پر مزید تحقیق کی روشنی میں ہمدرد لیبارٹریز کے لیے مضبوط و مستحکم بنیادیں فراہم فرمائیں۔ طب کی دنیا میں اُن کی طب چین کے حوالے سے کئی کتابیں اس سلسلے میں مشعل راہ ہیں۔

یوں تو کہنے کو بہت کچھ ہے اور لکھنے سے قلم بھی نہیں گھبراتا۔ پھر بھی اپنی بات ختم کرنے سے پہلے میں یہاں اُن کے بڑے بھائی حکیم عبدالحمید دہلوی مرحوم کا اپنے چھوٹے بھائی کی تدفین کے وقت کہا ہوا ایک فقرہ دہرانا چاہتا ہوں جو انھوں نے سیکڑوں غمزدہ لوگوں کے سامنے کہا تھا ”میں نے سعید کو سیاست میں جانے سے روکا تھا“

مجھے نہیں معلوم کہ اُن کے بڑے بھائی نے یہ تاکید اپنے چھوٹے بھائی کو کس پس منظر میں کی تھی مگر میں اپنے طور پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ اُس وقت ملک میں رائج بدعملی، بددیانتی اور افراتفری کو روکنے کے لیے حکیم محمد سعید مرحوم اس حدیث مبارکہ کی عملی تصویر بن گئے تھے۔ ”برائی کو دیکھ کر خاموش نہ بیٹھو بلکہ بڑھ کر پوری قوت سے روکو۔ اگر کسی طرح یہ ممکن نہ ہو تو برائی کو برملا برائی کہنے کی جرأت کرو اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو برائی کو بہرحال برائی سمجھو۔“ وہ تو اس حدیث پر عمل کرنے کے پہلے مرحلے پر ہی سینہ سپر ہو گئے تھے کہ قتل کر دیے گئے۔

اس آخری عبارت میں اُن کی صلاحیتوں کے اعتراف کے طور پر اگر میں یہ حقیقت بھی واگزار کرتا چلوں کہ اپنے مختصر سے گورنری کے عہد میں انھوں نے چار نجی شعبوں کو جامعات کھولنے کی اجازت دے دی تھی۔ شاید یہ بھی اُس عہد کا جرم تھا جو اربابِ اقتدار کو پسند نہیں آیا تھا: ”خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را“

''ہم بھی وہاں موجود تھے''

جمیل یوسف/مری

جب جناب جنرل عبدالمجید ملک صاحب کی خودنوشت داستانِ حیات ''ہم بھی وہاں موجود تھے'' کا نام سننے میں آیا تو معاً مجھے پیرو مرشد سید ضمیر جعفری مرحوم کا وہ جملہ یاد آ گیا جو انہوں نے مشہور مزاح نگار کرنل محمد خان کے مجلے اردو پنچ کے پہلے شمارے پر نظر پڑتے ہی بے ساختہ کہا تھا ''آپ نے تو قارئین کا آدھا دل رسالے کے نام اور سرورق سے ہی موہ لیا ہے۔''

محترم جناب عبدالمجید ملک نے اپنی کتاب کی نصف کامیابی تو اس کے نام سے ہی حاصل کر لی ہے۔ ''ہم بھی وہاں موجود تھے'' کسی بھی خودنوشت سوانح عمری کا ایک نہایت خوبصورت اور معنی خیز نام ہے۔ آپ نے ابن انشاء کے یہ مشہور بلکہ زبان زدِ خاص وعام اشعار ضرور سنے ہوں گے:

کل چودھویں کی رات تھی شب بھر رہا چرچا ترا
کچھ نے کہا یہ چاند ہے کچھ نے کہا چہرا ترا
ہم بھی وہاں موجود تھے، ہم سے بھی سب پوچھا کیے
ہم ہنس دیے، ہم چپ رہے، منظور تھا پردا ترا

مگر جنرل عبدالمجید ملک صاحب چپ نہیں رہے۔ نہ انہیں کسی کا پردا منظور تھا۔ انہوں نے اپنی زندگی میں جو کچھ دیکھا اور جو کچھ سنا، سب کچھ برملا لکھ دیا ہے۔ البتہ اگر کچھ کلام ہو سکتا ہے تو اس کام میں جو انہوں نے کیا ہے یا نہیں کیا ہے۔

ماشاء اللہ اب جنرل صاحب کی عمر عزیز ۹۵ سال کے لگ بھگ ہے۔ ان کی خودنوشت کم وبیش پچھلے ۷۵ سال پر پھیلی ہوئی طویل کہانی ہے جسے انہوں نے کہیں تفصیل اور کہیں اجمال کے ساتھ بیان کیا ہے۔

یہ صرف ان کی ذاتی کہانی نہیں ہے بلکہ پچھلے ۷۵ سال میں یعنی ۱۹۴۰ سے لے کر جب وہ بیس اکیس سال کے تھے، ۲۰۱۵ء تک کہ اب وہ ۹۵ سال کے ہیں۔ جو کچھ ان پر گزری اور جو کچھ اُن جیسے جرنیلوں اور سیاست دانوں کے ہاتھوں وطنِ عزیز پاکستان پر گزری ہے اس سب کا حال ہے۔ شاید ہی اس وقت پاکستان میں جنرل عبدالمجید ملک صاحب سے زیادہ طویل العمر کوئی اور بزرگ سیاستدان ہو جس نے نہ صرف تحریک پاکستان کے آخری مراحل، ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء تک اور قیام پاکستان کے بعد سے لے کر اب تک کے واقعات کو اتنے قریب سے دیکھا ہو اور پاکستانی فوج کے اندرونی رازوں سے بھی اس قدر آگاہ ہو۔ صرف یہی نہیں بلکہ جنرل صاحب نے ان حالات و واقعات کی تشکیل پذیری میں بھی بالخصوص ۱۹۸۵ء سے لے کر ۲۰۱۳ء تک کبھی سامنے اور کبھی پس پردہ عملی کردار بھی ادا کیا ہے اس لیے اُن کی یہ خودنوشت پاکستان کی تاریخ کا ایک مستند حوالہ بھی ہے۔ اُن کے بیان کی تفصیل اور بعض مقامات پر ان کا اختیار کردہ اختصار، دونوں بہت کچھ بتاتے ہیں۔

جناب جنرل عبدالمجید ملک کو یہ منفرد اعزاز بلکہ افتخار بھی حاصل ہے کہ وہ پاکستان کے اکلوتے جرنیل ہیں جنہوں نے فوج سے ریٹائرمنٹ کے بعد بغیر کسی حکومتی تائید وحمایت کے اور بغیر کسی قسم کے سیاسی پس منظر کے، عملی سیاست میں قدم رکھا اور اپنی کامیابیوں کے جھنڈے گاڑ دیے۔ اپنے حلقہ انتخاب سے جنرل صاحب ایک دو دفعہ نہیں بلکہ پورے پانچ دفعہ قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے ہیں۔ متعدد بار وفاقی وزیر کے عہدے پر متمکن رہے ہیں۔ جب وہ وفاقی وزیر خوراک و پیداوار تھے یو این او کے عالمی ادارے ایف اے او (فوڈ اینڈ ایگری کلچر آرگنائزیشن) کے روم میں منعقدہ سالانہ اجلاس کے صدر چنے گئے اور اس حیثیت میں پاپائے روم نے انہیں ملاقات کی دعوت دی۔ یہ اعزاز پاکستان کے کسی اور وزیر، سفیر یا جرنیل کو نہیں ملا۔

پاک فوج کے جرنیلوں میں بھی جنرل عبدالمجید ملک صاحب کو یہ منفرد امتیاز حاصل ہے کہ جب ۱۹۷۱ء کی جنگ میں، ہمارے سارے جرنیل سر بہ زانو تھے اور جنرل یحییٰ اور جنرل نیازی ہتھیار ڈالنے کے لیے بے تاب ہو رہے تھے جنرل عبدالمجید ملک نے حسینی والا سیکٹر میں دفاعی پوزیشن سے خود اپنے طور پر آگے بڑھ کر بھارتی علاقے پر یلغار کر دی اور دشمن کے علاقے میں گھس کر اچانک حملہ کر کے بھارت کے قیصر ہند نامی قلعے پر قبضہ کر لیا۔ وہاں موجود بھارتی فوجیوں کے پاس بدحواسی میں اپنا سب کچھ چھوڑ کر راہ فرار اختیار کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ رہا۔ جنرل عبدالمجید ملک نے بھارت کے قیصر ہند قلعے پر پاکستانی پرچم لہرا دیا۔ پھر جب ۱۹۷۲ء میں جنرل صاحب کو جی او سی ۱۲ ڈویژن مری لگایا گیا تو انہوں نے ایک اور بہادری اور جرأت کا کارنامہ سرانجام دیا۔ ہوا یوں کہ ابھی وہ مری پہنچے ہی تھے اور ابھی انہوں نے اپنی کمان سنبھالی بھی نہ تھی کہ بھارتی فوج نے گزشتہ رات

آزاد کشمیر میں پہاڑوں کی چوٹیوں پر واقع پاکستان کی تین فوجی چوکیوں پر اچانک حملہ کر کے قبضہ کر لیا اور ہمارے کئی فوجی جوانوں کو شہید کر دیا۔ جنرل صاحب اُسی دن اپنی فوجی چوکیاں بھارت کے قبضے سے چھڑانے پر کمربستہ ہو گئے۔ ان دنوں ہماری فوج کا مورال ڈاؤن تھا۔ ۱۹۷۲ء کی جنگ میں عبرتناک بلکہ شرمناک شکست کے نتیجے میں ہمارے پچاس ساٹھ ہزار فوجی اپنے کاغذی ٹائیگر جنرل نیازی کے حکم پر بھارت کے قیدی بن چکے تھے بھارتی فوجی اونچی ہواؤں میں تھے۔ اسی برتری کے زعم میں انہوں نے کشمیر میں پیش قدمی کر کے تین پاکستانی چوکیوں پر اچانک حملہ کر کے قبضہ کر لیا تھا۔ جنرل عبدالمجید ملک کا موقف یہ تھا کہ فوری طور پر ایکشن لیا جائے اور بھارتیوں کو ان چوکیوں سے مار بھگایا جائے ورنہ ہماری فوج میں مزید بددلی اور مایوسی پھیلے گی۔ اس وقت کے کمانڈر انچیف کے تحفظات کی پروانہ کرتے ہوئے جنرل عبدالمجید ملک نے مظفرآباد میں اپنے فوجی دستوں کو فی الفور ایکشن کارروائی کا حکم دیا۔ خود آپریشن کی نگرانی کی۔ اگلی صبح جب بھارتی فوجی ابھی جاگے بھی نہ تھے ہمارے مجاہد ان کے سروں پر پہنچ گئے اور وہ دو تین لاشیں چھوڑ کر سرپٹ بھاگ کھڑے ہوئے۔ تینوں چوکیوں پر پاکستان کا قبضہ بحال کر دیا گیا۔ اس دوران دہلی سے مقبوضہ کشمیر کی ہائی کمان کو بھیجا گیا ایک سگنل پیغام پکڑا گیا جس میں بھارتی کمانڈر کو خبردار کیا گیا تھا کہ مری میں جو نیا جی او سی آیا ہے یہ وہی جنرل ہے جس نے قیصر ہند قلعے پر حملہ کیا تھا۔ اس لیے محتاط اور چوکس رہو۔

جنرل عبدالمجید ملک کی آپ بیتی میرے لیے اس لیے بھی خصوصی دلچسپی کا موجب ہے کہ جنرل صاحب میرے گرائیں ہیں۔ ان کا گاؤں جند میرے آبائی گاؤں لنگاہ سے صرف دو ڈھائی کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ لنگاہ وہی گاؤں ہے جس کے بارے میں کرنل محمد خان نے لکھا ہے کہ یہ قصبہ بڑا مردم خیز اور زن شناس ہے۔ جنرل صاحب سے محبت کا ایک اور رشتہ بھی ہے وہ میرے والد گرامی قابل صد احترام شیخ محمد یوسف مرحوم کے شاگرد بھی رہے ہیں۔ پچھلے دنوں ایک شام جب سینئر جنرل عبدالقیوم مجھے چکوال مین جنرل عبدالمجید ملک صاحب کے گھر لے گئے تو میں نے کہا میرے شاگرد مجھے میرے اباجی کے شاگرد سے ملنے لائے ہیں۔ جنرل عبدالقیوم پر مجھے فخر ہے۔ اُن کے کالموں کے مجموعے فکر و خیال میں ان کے بارے مین میرا مضمون پڑھیں۔

مین جنرل عبدالمجید ملک صاحب کو ذاتی طور پر ۱۹۶۷ء سے جانتا ہوں۔ جب وہ پشاور میں کرنل شاف تھے۔ ان دنوں میری پوسٹنگ بھی پشاور میں تھی۔ پھر جب ۱۹۷۵ء میں دوبارہ میں پشاور پوسٹ ہوا تو جنرل صاحب پشاور میں کور کمانڈر تھے۔ جنرل صاحب خاصا شستہ ادبی ذوق رکھتے ہیں۔ انہیں متعدد اشعار یاد ہیں۔ انہوں نے اپنی آپ بیتی میں اپنے اردگرد کے ماحول کا نقشہ بڑی خوبی سے کھینچا ہے۔ اپنی جوانی کے زمانے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہمارا علاقہ اگرچہ مسلم اکثریتی علاقہ تھا۔ مگر ہر گاؤں میں دو یا تین ہندوؤں اور سکھوں کے گھر ضرور تھے۔ ہندوؤں اور سکھوں نے تجارت پر اجارہ داری حاصل کر رکھی تھی اور مسلمان اکثر اوقات ان کے مقروض اور مرہونِ احسان ہی رہتے۔ کسی بھی گاؤں میں ان غیر مسلموں کے گھر معاشی طور پر مرکزی حیثیت رکھتے تھے۔ مگر ایک بات جس کا ذکر میں ضروری سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ ہندو اور سکھ اور مسلمان، ان تینوں کے درمیان جو افہام و تفہیم تھی اس کی صورتِ حال موجودہ صورتِ حال سے بہت بہتر تھی جو کہ اب مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے درمیان پائی جاتی ہے۔ اس زمانے میں نہ اتنے عالم تھے اور نہ اتنی کتابیں۔ سیدھے سادے مسلمان تھے جن میں بغض اور نفاق کا شائبہ تک نہ تھا۔ عبادت گاہوں میں بھی کسی ایسے پہلو کا ذکر نہیں کیا جاتا تھا جس سے فرقہ واریت کا اظہار ہو۔ لوگوں کے عقائد پر کوئی سوالیہ نشانات نہیں تھے۔ لوگوں کا ایمان اور عقیدہ سادہ مگر مضبوط تھا اور اس میں کوئی پیچیدگی یا ملاوٹ نہیں تھی۔ اس دور کے سادہ طرزِ زندگی میں برداشت کا عنصر بہت زیادہ تھا۔ وہ دور نہایت پرسکون دور تھا۔ وسائل نہ ہونے کے باوجود لوگ مطمئن تھے...... اُس دور میں سارے معاشرے اور ماحول پر ایک خاص قسم کی معصومیت اور سادگی کی فضا غالب تھی۔ دیہات میں خواتین ظاہری پردہ نہیں کرتی تھیں مگر ان کی آنکھوں میں موجودہ زمانے والی بے باکی کے بجائے حیا کا عنصر موجود تھا اور مرد بھی صحیح معنوں میں خواتین کا احترام کرتے تھے۔ کیا مجال جو کوئی مرد کسی کی بہن بیٹی کو آنکھ اُٹھا کر غلط نگاہ سے دیکھے۔ اکثر گھروں کی چار دیواری نہیں ہوتی تھی۔ لوگ ایک دوسرے کے صحن سے گزرتے رہتے تھے لیکن کسی کو کوئی شکایت ہوتی تھی اور نہ ہی کوئی غیر اخلاقی اور غیرت کا مسئلہ پیدا ہوتا تھا۔ اگر کبھی بدقسمتی سے کسی گاؤں میں کوئی لڑائی

یا جھگڑا ہو جاتا تو اس میں صرف ڈانگ ہی چلتی، وہی اُس دور کی کلاشنکوف تھی...... صبح سویرے کسان اور دوسرے پیشوں کے لوگ جلدی جاگ اُٹھتے تھے۔ کسان کھیتوں میں ہل چلانے جاتے اور دن کے دس گیارہ بجے انہیں گھ   ے روٹی اور لسی وغیرہ بھیجی جاتی۔ دوپہر کو ہانڈی پکانے کا سلسلہ بالکل نہیں تھا اور نہ ہی چائے کا رواج تھا۔ بلکہ چائے نام کی چیز سے لوگ بالکل ہی ناواقف تھے۔ سب لوگ دن میں عام طور پر صرف دو بار ہی کھانا کھاتے تھے۔''

جنرل صاحب ۱۹۶۵ء کی جنگ کا حال لکھتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''اختر ملک پاکستان کے ایک بڑے باہمت جرنیل تھے جو چھمب جوڑیاں آپریشن کے انچارج تھے۔ اختر ملک نے چند روز میں حیرت انگیز حد تک کامیابی حاصل کی اور دریائے توی تک جا پہنچے۔ مگر عین اس وقت جب کہ اختر ملک کا اگلا قدم کامیابی اور کامرانی کی منزل پر پڑنے والا تھا اور اکھنور پر قبضہ یقینی نظر آ رہا تھا اس موقع پر صدر ایوب خان سے ایک بہت بڑی غلطی سرزد ہوئی۔ اس نے ۱۲ ڈویژن کی کمان اختر ملک کے بجائے جنرل یحییٰ خان کو سونپ دی۔ جنگی حکمت عملی اور منصوبہ سازی کے لحاظ سے کسی بھی آپریشن کے دوران اُس کمانڈ کی تبدیلی جو کامیابی کی طرف گامزن ہو، اس کی مثالیں عسکری تاریخ میں بہت ہی کم ملتی ہیں۔ یہ عمل Changing horses in the middle کہلاتا ہے۔ کیونکہ یہ وہ فیصلہ ہے جس کے مثبت نتائج نکلنے کے امکانات نہ ہونے کے برابر تصور کیے جاتے ہیں۔ ۱۲ ڈویژن کی قیادت کی اس تبدیلی کے دوران کمانڈرز کے چارج کے ہینڈنگ ٹیکنگ اوور کے عمل کے باعث ۲۴ سے ۴۸ گھنٹے کی جو تاخیر ہوئی، انڈین آرمی نے اس کا بھرپور فائدہ اُٹھایا اور دریائے توی کے اُس پار ان کو اپنی دفاعی پوزیشن مضبوط کرنے کا موقع مل گیا۔ میرا خیال ہے کہ اگر یہ تبدیلی نہ ہوتی تو اکھنور پاکستان کی گرفت میں تھا۔''

جنرل صاحب نے اس بات کا تذکرہ نہیں کیا کہ صرف کمان کی تبدیلی میں ہی قیمتی اور فیصلہ کن وقت ضائع نہیں ہوا بلکہ کمان سنبھالنے کے بعد براستہ گجرات محاذ جنگ پر جاتے ہوئے یحییٰ خان نے راستے میں اپنی داشتہ اقلیم اختر عرف جنرل رانی کے کوٹھے پر پڑاؤ ڈال دیا اور اپنی فرضی فتح کا جشن منانے میں مگن ہو گیا۔ شراب و شباب سے بڑھ کر اسے اور کوئی شے مرغوب نہ تھی۔

جنرل عبدالمجید ملک صاحب نے ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ کا ذکر کرتے ہوئے یہ نہیں لکھا کہ آپریشن کی کامیاب پیش رفت کے دوران کمان کی تبدیلی کا احمقانہ اور ملک دشمن عمل پھر دہرایا گیا اور اس بار خود جنرل یحییٰ نے جو زبردستی کا صدر پاکستان بنا بیٹھا تھا۔ مشرقی پاکستان کے محاذ پر جنرل ٹکا خان کی جگہ جنرل نیازی کو بھیج دیا کہ کہیں ایسا نہ ہو مشرقی پاکستان میں پاک فوج کو شرمناک شکست سے دوچار کرانے کا اس کا منصوبہ ناکام ہو جائے۔ کیونکہ اس محاذ پر ذلت آمیز شکست اور مشرقی پاکستان کی علاحدگی کے بغیر یحییٰ کے تاحیات صدر اور بھٹو کے تاحیات وزیراعظم بنے رہنے کی اور کوئی صورت نہ تھی۔ یہی ان دونوں کا پلان تھا۔ بعد میں بھٹو کو یعنی الیکشن ۱۹۷۰ء میں ہارے ہوئے شخص کو جب یحییٰ نے اپنا نمائندہ بنا کر یو این او بھیجا تو وہ فوری طور پر سیدھا نیویارک پہنچنے کی بجائے بیماری کا بہانہ بنا کر لندن میں بیٹھا رہا کہ ڈھاکہ پر جب بھارتی فوج کا قبضہ ہو جائے تو پھر وہ اقوامِ متحدہ پہنچے۔ آخر جب وہ وہاں پہنچا تو اس وقت سیکورٹی کونسل کے اجلاس میں پولینڈ کی پیش کردہ قرارداد (نمبر 307) پر بحث ہو رہی تھی۔ اس قرارداد کی رو سے جنگ بندی ہو جاتی اور دونوں طرف کی فوجیں جنگ سے پہلے والی پوزیشنوں پر چلی جاتیں۔ مگر یہ بات نہ بھٹو کو منظور تھی اور نہ اس کے باس یحییٰ کو۔ چنانچہ بھٹو نے اس قراردادو کو پاکستان کی طرف سے منظور کرنے کی بجائے اسے پھاڑ کر فرش پر پھینک دیا اور اجلاس سے واک آؤٹ کر گیا۔ اُس نے کہا "I am wasting my time here" (دیکھئے صفحہ ۱۱۴، ۱۱۵)

بھٹو ٹھیک کہہ رہا تھا۔ ڈھاکہ پر بھارتی فوج قبضہ کر چکی تھی۔ پولش ریزولیشن کو بروئے کار لا کر بھارتی فوج کا قبضہ ختم کرانے کے بجائے بھٹو کو تو واپس اسلام آباد پہنچ کر بچے کھچے پاکستان کا اقتدار سنبھالنا تھا۔ وہ واقعی نیویارک میں اپنا وقت ضائع کر رہا تھا۔ اسی سچائی کو چھپائے رکھنے کے لیے تو اس کے اقتدار سنبھالنے کے بعد جنرل یحییٰ کو نظر بند کر دیا گیا تھا تاکہ اس کی زبان بند رہے۔ نہ اس کا ٹرائل ہوا اور نہ حمودالرحمان کمشن کی رپورٹ شائع کی گئی۔

اب جنرل عبدالمجید ملک صاحب کی داستانِ حیات کی طرف لوٹتے ہیں۔ جنرل صاحب نے فوج سے ریٹائرمنٹ کے بعد جب سیاست میں قدم رکھا تو بلاشبہ قدم قدم پر حیران کن اور بے مثال کامیابیاں حاصل کیں۔ یہ ان کی زبردست حکمت عملی، منصوبہ بندی، عزمِ صمیم اور انتھک کوششوں کا نتیجہ تھا۔ ان مراحل کا انہوں نے بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ وہ چکوال میں مدتوں سے مسلط

سردارانہ جاگیرداری نظام کے خلاف اُٹھے تھے اور انہوں نے نہایت کامیابی سے اس ظالمانہ تسلط کے بخیے اُدھیڑ کر رکھ دیے۔ مگر افسوس صد افسوس کہ جنرل صاحب بھی آخر میں پاکستان کے روایتی سیاست دانوں کی طرح مصلحت اور مفاد پرستی کا شکار ہو گئے اور اقتدار کی ہوس میں انہی سرداروں اور جاگیرداروں سے سمجھوتہ اور اتحاد کر لیا جن کے خلاف اُٹھے تھے۔ کتاب کے صفحہ نمبر ۲۷۲ پر خود لکھتے ہیں:

"کچھ حلقوں نے کہا کہ جنرل صاحب نے ضلع چکوال سے سرداری نظام کے جس پودے کو اکھاڑنے کا عزم کیا تھا، اس کو ایک مرتبہ پھر پانی دے کر ہرا کر رہے ہیں۔ میرے کچھ قریبی دوستوں نے بھی سردار گروپ سے سیاسی الحاق کی کڑوی گولی نگلنے میں ہچکچاہٹ محسوس کی۔ مگر ہم حالات و واقعات کے تناظر میں یہ سب کچھ کر گزرے۔" جنرل صاحب نے یہ واضح نہیں کیا کہ یہ تناظر کیا تھا اور ہر قیمت پر اقتدار کے حصول کی اس بھونڈی کوشش کا آخر کیا جواز تھا۔ نہ اپنے قریبی حلقوں کا صائب مشورہ اور نہ غیروں کی کڑی تنقید، ان کو مفاد پرستانہ اقدام سے باز رکھ سکی۔ وہ خالص جمہوری عمل سے وفاقی وزارتوں تک پہنچے تھے۔ مگر اب انہوں نے فوجی ڈکٹیٹر جنرل مشرف کے حواریوں کے گھٹنے چھونے شروع کر دیے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جب کسی چیز کے حصول کا پختہ ارادہ کر لیتے ہیں تو کسی رکاوٹ سے نہیں رُکتے۔ مگر ان کے اس ثابت شدہ رویے اور طرزِ عمل کی روشنی میں چکوال ریلوے لائن اُکھاڑے جانے کے حوالے سے ان کا یہ بیان قاری کو حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"جب مندرہ بھون ریلوے سروس کا خاتمہ ہوا تو میرے مخالفین نے اس معاملے کو بہت اُچھالا اور مجھے بلاوجہ اس کا قصوروار گردانا گیا۔ میرے لیے ضروری ہے کہ میں ریلوے کے اس معاملے کے حقائق واضح کروں۔ اصل صورتحال یہ تھی کہ ۱۹۹۰ء کی دہائی کے اوائل میں پاکستان ریلوے کا محکمہ اچانک خسارے میں چلا گیا (جنرل صاحب نے اس کے اسباب بیان نہیں کیے)۔ ریلوے نے ملک بھر میں ان ریلوے لائنز کا جائزہ لیا جو اس خسارے کا باعث تھیں (کوئی ریلوے لائن خسارے کا باعث نہیں تھی۔ یہ سب ریلوے حکام کی ٹرانسپورٹ مافیا کے ساتھ ملی بھگت کا نتیجہ تھا)۔ بدقسمتی سے مندرہ چکوال بھون ریلوے لائن مذکورہ خسارے کے حساب سے سرفہرست تھی۔ مجھے جب اس بات کا علم ہوا کہ پاکستان ریلوے کا محکمہ مندرہ چکوال لائن کی بندش کے بارے میں سوچ رہا ہے تو میں نے وزارتِ ریلوے اور دیگر حکام سے دو دفعہ رابطہ کیا۔ تو انہوں نے دونوں مرتبہ حقائق اور اعداد و شمار پیش کر کے ایسے ٹھوس دلائل دیے جن کو رد کرنا ممکن نہ تھا۔ ریلوے حکام نے آخری اجلاس میں جب ہمارے سامنے اپنے اعداد و شمار رکھے تو ہم لاجواب ہو گئے۔" (صفحہ ۳۰۳)

یہ اندازِ بیان ہی چغلی کھا رہا ہے جناب جنرل صاحب! آپ اتنی آسانی سے لاجواب کیسے ہو گئے۔ آپ نے ریلوے حکام کو یہ کیوں نہ بتایا کہ مندرہ چکوال ریلوے لائن کے خسارے کی اصل وجہ یہ تھی کہ چکوال کی ٹرانسپورٹ مافیا سے ملی بھگت کر کے محکمہ ریلوے نے گاڑی کے اوقات ایسے رکھے ہوئے تھے کہ لوگ اس پر سفر نہ کر سکیں۔ گاڑی صبح تین بجے چکوال سے راولپنڈی کے لیے چلائی جاتی تھی اور اہتمام یہ کیا گیا تھا کہ آٹھ نو بجے یعنی پانچ چھ گھنٹے بعد راولپنڈی پہنچے۔ پھر اسے لیٹ کر کے مزید دیر سے پہنچنے کے ہتھکنڈے بھی تھے۔ اس سازش سے ریلوے سسٹم کو جان بوجھ کر تباہ کیا گیا۔ کیا آپ اس سے بے خبر تھے۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ جب ۱۹۷۲ء میں بھٹو وزیراعظم بنا اور اس نے جہلم کے انتخابی حلقے سے تعلق رکھنے والے ممبر قومی اسمبلی جناب ڈاکٹر غلام حسین کو وزیر ریلوے بنایا تو ڈاکٹر صاحب کے حکم پر چکوال ریلوے نے اپنے اوقات کا شیڈول بدلا۔ ٹرین صبح چھ بجے چکوال سے راولپنڈی کے لیے روانہ ہونے لگی اور دو گھنٹے میں یعنی آٹھ بجے راولپنڈی پہنچنے لگی تھی۔ مسافروں کا اتنا رش ہو گیا کہ ٹرین کھچا کھچ بھری ہوئی ہوتی تھی۔ بیٹھنے کی جگہ نہیں ملتی تھی۔ آپ نے ریلوے حکام کو ازسرنو ڈاکٹر غلام حسین کے حکم کے مطابق عمل کرنے کی ہدایت کیوں نہ کی۔ آپ نے قارئین کو یہ بھی نہیں بتایا کہ ریلوے کی بندش سے فائدہ کس نے اُٹھایا۔ ٹرانسپورٹ مافیا اور اڈہ مافیا کے مالکان کون ہیں۔ چکوال ریلوے کی طرح میونسپل کمیٹی کے بنائے ہوئے وسیع و عریض اڈے کو بھی کیوں ناکارہ بنا کر رکھ دیا گیا۔ جنرل صاحب کو اس پر بھی کچھ روشنی ڈالنی چاہیے تھی۔

افسوس صد افسوس ہم نے ایک سو سال سے رواں دواں ریل گاڑی نہ صرف بند کر دی اور عوام کو ایک بہتر پُرسہولت اور دل خوش کرنے والے سفر سے محروم کر دیا بلکہ ریل کی پٹڑیاں بھی اُکھاڑ کر لے گئے۔ تاکہ ریلوے سروس کی بحالی کا خدشہ نہ رہے۔ بے چارے لوگ ویگنوں اور بسوں میں دھکے کھاتے پھریں اور اپنے گوڈے چھلواتے رہیں۔ کیونکہ ہم نے تو ٹرانسپورٹ مافیا اور اڈہ مافیا کی تجوریاں بھرنی تھیں۔ یہ ظلم اور قومی وسائل پر یہ ڈاکہ تو سرداروں کے دور میں بھی نہیں پڑا تھا۔ معلوم نہیں ہم خدا کو کیا جواب دیں گے۔

اطہر رضوی (مرحوم) کی ''چہرے، باتیں، یادیں، لوگ''

ستیہ پال آنند

آیئے، یہاں سے بات شروع کریں کہ یہ کتاب اُردو میں اپنی قسم کی واحد کتاب نہیں ہے۔ اس سے پیشتر اس قبیل و قماش کی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اپنے ''سرحرف'' میں خود اطہر صاحب نے ''نکات الشعرا'' کا اور کچھ دیگر کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ البتہ ترقی پسند ادیبوں کے تحریر کردہ شخصی خاکوں نے انہیں اپنی طرف متوجہ نہیں کیا۔ انھوں نے درجنوں کی تعداد میں ''من تراحاجی بگویم......'' کے بمصداق ایک دوسرے کے خاکے بھی لکھے، پیروڈیاں بھی پیش کیں، کیری کیچر بھی تحریر کیے اور کچھ ایک (دو نام ذہن میں فوری طور پر آتے ہیں، کنہیالال کپور اور فکر تونسوی) نے تو اپنے طنزیہ طرزِ تحریر میں دوستوں کی صورت، وضع، چلن اور ''چونکہ، از آنکہ، ازبسکہ'' وغیرہ سابقوں اور لاحقوں کا استعمال کرتے ہوئے ان کے ساتھ وقوع پذیر ہوئی مصاحبت اور مجالست کی مٹی بھی پلید کی لیکن کسی نے اس کا برا نہیں منایا بلکہ ایسے خاکوں کا خیر مقدم کیا گیا۔

تو چلئے، بات شروع ہو گئی۔ اطہر رضوی کے تحریر کردہ خاکوں کے مجموعے میں چہرے بھی ہیں، باتیں بھی ہیں، یادیں بھی ہیں اور لوگ تو ہیں ہی، سوائے الیکزانڈر پشکن کے (جس کے ساتھ اطہر رضوی صاحب کے باہمی میل جول، نشست و برخاست، راہ و رسم اور ہم ذات یا ہم زاد ہونے کے بارے میں راقم الحروف کو کوئی علم نہیں ہے!)......تو پہلے چہروں کو ہی لیں۔ یاد رہے کہ کسی شخص کا چہرہ ہر بار بہ نفسِ نفیس وہی نہیں ہوتا جو صاحب چہرہ کو ہر صبح آئینے میں نظر آتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ کسی دیکھنے والے کو اس میں ابطال اور مغائرت بھی نظر آتی ہو، اور چہ آنکہ ہر لکھنے والے کا فرض ہے کہ اپنی تحریر میں وہ اس عدم ترتیب اور انفساخ کا ذکر نہ کرے جو اس کی آنکھیں اسے دکھاتی ہیں، تو بھی اطہر رضوی صاحب جیسے اہل قلم کو، جنھیں اپنی ہر بات احوال واقعی کے طور پر کہنی ہے، آپ کس زمرے میں رکھیں گے؟ تو حضرات، اگر صاحب کتاب نے کچھ چہرے ایسے پیش کیے ہیں جو ساخت اور شبیہ میں ''نقل برابر اصل'' نہیں ہیں، تو یہ فرض کر لیجیے کہ انہیں اپنے اور صاحب چہرہ کے تعلقات میں یہ چہرہ اسی طرح نظر آیا جیسا کہ انہوں نے ''نقل برابر ذہنی اصل'' کے طور پر پیش کیا ہے۔ کیونکہ وہ ایک ایماندار اہل قلم ہیں اور ذہن رسا سے بڑھ کر اور کون سی چیز ایک اچھی رہنما ہو سکتی ہے؟

چہروں کی بات تو ہو گئی۔ اب آئیں باتوں کی طرف، وہ اس لیے کہ صاحبِ کتاب نے باتوں کو یادوں سے پہلے رکھا ہے۔ بات گفتگو سے بھی اخذ کی جا سکتی ہے، اس کا بتنگڑ بھی بنایا جا سکتا ہے، یہ بغیر سر پیر کے بھی ہو سکتی ہے اور آمنا و صدقنا بے تامل اسے ایمان بالغیب کی طرح بھی تسلیم کیا جا سکتا ہے لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ بات ایقان کی حد تک صحیح ہو اور اس میں تشکک یا کفر و الحاد کی کوئی گنجائش نہ ہو۔ جی نہیں، یہ ممکن نہیں ہے! صاحب کتاب یعنی اطہر صاحب ہر وقت کہاں جیب میں یا میز کے نیچے چھپا کر ایک ٹیپ ریکارڈ رکھ سکتے تھے کہ وہ ہر ایسی بات ریکارڈ کر لیں جس پر بعد میں کہنے والے کو اعتراض ہو کہ یہ بات تو اس نے کہی ہی نہیں تھی۔ تو صاحبو! طے یہ ہوا کہ چہروں کی طرح باتیں بھی Quote Unquote کی شکل میں بجنسہٖ تحریر میں نہیں لائی جا سکتیں۔ ان میں بھی افراط و تفریط کی گنجائش ہے۔ بیش از بیش مدح سرائی بھی کی جا سکتی ہے اور بے وقعتی کی حد تک کہتر و کمتر بھی بنائی جا سکتی ہے۔ اقبال نے یونہی تو نہیں کہا تھا ؏ کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو؟

یادیں؟ جزاک اللہ! سنسکرت میں تین الفاظ ہیں جو کسی بات کی صداقت کو پیمانے کی طرح ماپتے ہیں۔ پہلا ''ساکھشی'' ہے یعنی عینی گواہ کے طور پر دیکھا گیا منظر یا سنی گئی بات۔ یہ کلمۃ الحق کی طرح مانا گیا ہے۔ بشرطیکہ ساکھشی خود بلا شک و ریب سچا شخص ہو۔ دوسرا ''شروتی'' ہے یعنی کسی دوسرے شخص سے سنی گئی بات یا دیکھے گئے منظر کا احوال نامہ۔ اسے کمتر مانا گیا ہے، یعنی سچائی ہوتے ہوئے بھی اس میں گمان اور وسوسے کی گنجائش ہے۔ تیسرا ''سمرتی'' ہے یعنی ''یاد'' پر مبنی احوال نامہ۔ اس میں ارتداد کی گنجائش سب سے زیادہ ہے۔ مجھے علم نہیں ہے کہ آیا ہمارے اطہر صاحب روسو یا جارج دوئم کی طرح کوئی Daily Diary رکھتے تھے جس میں سونے سے پہلے دن بھر کی باتوں کا اندراج کیا کرتے تھے۔ بہرحال اب جو کچھ ہمارے سامنے ہے اسے تو سچ ماننا ہی پڑے گا کیوں کہ ''یادوں'' کا براہِ راست تعلق باتوں اور چہروں سے ہے۔ تو، حضرات، ڈالئے خاک سنسکرت کے ان ''جبڑہ توڑ'' الفاظ پر! ساکھشی، شروتی اور سمرتی!! کہاں سے آ گئے یہ اس مضمون میں؟ برا ہو ستیہ پال آنند کے ماہر السنہ ملائے مکتب ہونے کا! ہر بات میں لاطینی، فرانسیسی، انگریزی، فارسی، سنسکرت اور عربی کے کرم خوردہ الفاظ لے آتا ہے!

اب آئیں لوگوں کی طرف! ان کے بارے میں مجھے کچھ زیادہ کہنے کا اختیار اس لیے نہیں ہے کہ انہیں اطہر صاحب نے اپنی ہی عینک سے دیکھا ہے جس کا شیشہ ایک محدب عدسہ بھی ہو سکتا ہے، اس میں پاشیدگی، کوبیدگی بھی ہو سکتی ہے اور (یقیناً) یہ صاف و شفاف بھی ہو سکتا ہے لیکن ایک بات جو صاف نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ اطہر صاحب کی تحریر میں جھوٹی لچک اور غیر ضروری لوچ نہیں ہے۔ یہ سنگ و خشت کی طرح ہے، اس میں مرمر اور بلور یا الماس کی شفاف ملائمت تو

ہے لیکن پلپلا پن نہیں ہے۔ He calls a spade a spade اسی لیے کچھ خاکوں میں رنگ بھرتے ہوئے انہیں غیر محلول اور چسپیدہ رنگوں کا استعمال کرنا پڑا ہے۔ گیان چند جین (مرحوم) اور حمایت علی شاعر (خدا کے فضل سے بقید حیات)۔ ان دو خاکوں میں اس غیر گداختہ طرز بیان کا اندازہ ہوتا ہے جس کی صورت پذیری میں نا قابل خم الصاق اور اصالتؔ ہے۔ ہاں ''پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی'' کے بمصداق ڈاکٹر شرما، ثریا بی بی اور نسیم سید صاحبہ کے خاکے اسی دل گداختہ کی اپج ہیں، جس کی کمی او پر تحریر کردہ دو خاکوں میں کھٹکتی ہے لیکن بات لوٹ کر وہیں آ جاتی ہے کہ ایک خاکہ نگار کو ایماندار پہلے ہونا چاہیے اور اس کے لیے اگر اسے دل گداختہ کی قربانی بھی دینا پڑے تو جائز ہے لیکن اگر یہ کہا جائے کہ باقی کے خاکوں میں نرمی ہے، پلاسٹک ہے، لطافت ہے، ایثریت ہے جو اصلی چہروں، باتوں اور یادوں کو ''شیریں سخنی'' میں بدل دیتی ہے تو یہ بھی غلط ہوگا۔ اطہر صاحب شاید غالب کا یہ مقولہ تسلیم کرنے کے بعد قلم اُٹھانے پر راضی ہوئے ہیں:

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ باد بہاری کا

مجھے عالی صاحب کا خاکہ اس لحاظ سے بہت پسند آیا کہ اس میں یادیں بکثرت ہیں لیکن کالج کے زمانے کی ان حسین یادوں سے شروع کر کے اطہر کچھ صفحوں کے لیے عالی صاحب کو تو بھول جاتے ہیں اور لندن کے علاوہ کینیڈا تک اپنی ہجرت کی کہانی میں اُلجھ جاتے ہیں۔ یہاں سے پھر 'ہجرت زدہ' پاکستانی شعراء کی عادات واطوار کی Stereotyping لگ بھگ دو صفحوں میں بیان کی گئی ہے اور جب وہ عالی صاحب کی طرف لوٹتے ہیں تو 'یادیں'، 'باتیں' اور 'چہرہ' ایک وسیلے کے طور پر صرف ایک مقصد کے لیے استعمال کرتے ہیں اور وہ ہے عالی صاحب کی شخصیت! صفحہ ۲۱ سے اس مضمون کے آخر تک. واقعات، ذاتی تفصیلات، عالی صاحب کے اشعار اور ارشادات۔ سبھی ان کی شخصیت کا احاطہ کرتے ہیں۔ مجھے یہ طریق کار بہت اچھا لگا اور اگر میں کہوں کہ اس مجموعے کے تین بہترین خاکوں میں اس کا شمار کیا جا سکتا ہے تو غلط نہ ہوگا۔

حقی صاحب کا خاکہ بھی ایک یادگار سند کی طرح ہے۔ کہتے ہیں کہ رفتگاں کو برا نہیں کہا جاتا اور حقی صاحب جیسے فرشتہ صفت انسان کو برا کہہ بھی کون سکتا ہے؟ اطہر صاحب نے جیسے ان کی علمیت، ذہانت، ذکاوت اور روشن دماغی کا ذکر کیا ہے، وہاں اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے کہ ان کے کینیڈا کے مختصر قیام کے دوران میں انہوں نے خود حقی صاحب سے بہت کچھ سیکھا۔ ان کی نکتہ رسی، باریک بینی، سلیقہ اور معقولیت ان کے لیے مشعل راہ بن گئے۔ ان کی ''خوش طعامی'' کے قصے تو ان کے پائپ کی طرح کراچی سے کینیڈا تک پہلے ہی پہنچ چکے تھے، لیکن اطہر صاحب کے یہ محبت بھرے الفاظ ملاحظہ کیجیے ''جن محفلوں میں طعام کا بندوبست ہوتا، حقی صاحب بلا تکلف واجتناب ہر آئٹم کھاتے، انہیں مٹھائیاں بہت پسند تھیں، خصوصاً پیڑے، لڈو اور برفی۔ کھانے کے بعد وہ چپکے سے گھر سے باہر نکل کر ایک سگریٹ پیتے اور پھر واپس آ کر مسند صدارت سنبھالتے!'' واہ واہ کہے بغیر چارہ نہیں ہوتا یہ الفاظ پڑھنے کے بعد!

میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ کچھ خاکے ان سنہری رنگوں سے بھرے گئے ہیں، بادی النظر میں جن کی کمی اطہر صاحب جیسے Difficult to please شخص کے ہاں کھٹکتی ہے۔ ڈاکٹر من موہن شرما کا خاکہ ''ثریا'' (جسے وہ اپنی بہن کہتے ہیں) اور ان کی صاحبزادی سونیا کا خاکہ سلطان مہر صاحبہ کا خاکہ اور نسیم سید کا خاکہ..... ان میں محبت اور شفقت ایسے ہی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے جیسے اکرام بریلوی صاحب کے خاکے میں تحسین وعقیدت ہے۔

میں نے ایک پیش نہاد مقصد کے لیے یعنی جان بوجھ کر اس مختصر تقریر میں گیان چند جین (مرحوم) کے خاکے کا ذکر نہیں کیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ محترم شمس الرحمٰن فاروقی نے ان کی کتاب پر اپنے غیر یکساں تبصرے میں دو جگہوں پر میرے نام کو بھی کچھ اس طرح سے استعمال کیا ہے، جیسے میں بھی جین صاحب کے ''گناہ کبیرہ'' میں برابر کا شریک ہوں۔ مبادا میرے قلم سے کوئی نا شائستہ لفظ لکھا جائے جس پر ان کے یا ان کے حواریوں کو اعتراض ہو، میں نے اس خاکے کے بارے میں اپنی رائے محفوظ رکھی ہے۔ یہی بات حمایت بھائی صاحب کے خاکے کے بارے میں بھی ہے۔ کچھ برس پہلے جانے ان کے جی میں کیا سمائی یا وہ کسی شخص دیگر کے بہکاوے میں آ گئے، انہوں نے تابڑ توڑ دو تین طویل خطوط میرے ان اعتراضات کی نفی کے بارے میں چھپوا دیے جن میں (اعتدال کے ساتھ) میں نے اردو کی نئی بستیوں میں ان شاعرات کا ذکر کیا تھا جو ڈالروں کے بل بوتے پر Over night صاحب دیوان بن جاتی ہیں۔ مجھے حیرت بھی ہوئی کہ ایسی شاعرات کے دفاع کی حمایت بھائی صاحب جیسے بڑے شاعر کو کیا ضرورت تھی، لیکن میں نے ان کے مطبوعہ خطوط کا جواب نہیں دیا۔ مبادا کہ ان کے خاکے پر بحث میں میرے قلم سے کوئی نازیبا لفظ لکھا جائے، میں خاموش ہی رہا۔

آخر میں Pushkin کے خاکے کے بارے میں کچھ الفاظ! یہ ایک نفیس مضمون ہے اور کسی دیگر کتاب میں بھی چھپ کر اپنی آب وتاب سے آنکھوں کو خیرہ کر سکتا تھا، لیکن ''چہرے باتیں یادیں لوگ'' میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ اگر اس بات کو میری گستاخی پر محمول کیا جائے تو اطہر بھائی صاحب، گستاخی معاف!!

ناروے کا بابا مستان شاہ!

عطاء الحق قاسمی/لاہور

پرسوں ایک ''باباجی'' میرے پاس تشریف لائے۔ فقیری چوغا پہنا ہوا، گلے اور ہاتھوں میں منکے، ملگجی داڑھی، سر پر سندھی ٹوپی، ہاتھ میں ایک نوٹ بک جس کے متعلق یہ بھی پتا چلا کہ اس میں مختلف افسروں نے ''باباجی'' کے ''ولی اللہ'' ہونے کی تصدیق کی ہے۔

انھوں نے آتے ہی اپنا عصا زمین پر مارا اور کہا ''میں ہوں بابا مستان شاہ! پاکپتن شریف سے تمھیں دعا دینے آیا ہوں۔ اللہ تمھیں کسی کا محتاج نہ بنائے، تم ترقی کرو'' میں ان کی ہر دعا پر آمین کہتا رہا۔ وہ اپنی ہر دعا کے آخر میں کہتے ''پر تم غصہ نہ کیا کرو، ان دنوں بے شمار لوگوں کا بلڈ پریشر ہائی رہتا ہے، چنانچہ ان کے رویوں میں جھنجھلاہٹ آجاتی ہے'' اگر میرا بلڈ پریشر بھی ہائی ہوتا یا طبیعت میں غصہ ہوتا تو میری نظروں میں باباجی کی ''ولایت'' پکی تھی مگر اتفاق سے میرا بلڈ پریشر نارمل رہتا ہے اور حُسنِ اتفاق سے طبیعت میں غصہ بھی بہت کم ہے۔ چنانچہ باباجی کا وار خالی گیا۔ اپنی گفتگو کے دوران باباجی بغور میرے چہرے کی طرف دیکھتے رہے۔ وہ میرے تاثرات کا جائزہ لے رہے تھے اور اندازہ لگا رہے تھے کہ ان کی روحانیت مجھ پر کس حد تک اثر انداز ہو رہی ہے۔ میرے چہرے کے تاثرات سے انھیں شاید مایوسی ہوئی، چنانچہ وہ دعاؤں کے بجائے پیش گوئیوں پر اتر آئے۔

انھوں نے کہا ''اللہ تیری پریشانیاں دور کرے گا'' اب دنیا میں کون شخص ہے جسے کوئی پریشانی لاحق نہ ہو مگر اس سو فیصد صحیح تشخیص پر بھی مرعوب ہونے کے بجائے جب میں نے صرف ان شاء اللہ کہا تو باباجی نے مایوس ہو کر وہ نوٹ بک میرے سامنے رکھ دی جو انھوں نے بائیں ہاتھ میں تھامی ہوئی تھی اور اس میں سے صرف افسروں کے ریمارکس مجھے دکھانے لگے جو انھوں نے ''باباجی'' کی ولایت کے حوالے سے دیے تھے۔ میں نے سوچا کیا زمانہ آگیا ہے، اب اللہ والوں کو بھی دنیا والوں سے اپنی بزرگی کا سرٹیفکیٹ لینا پڑتا ہے۔ جب موصوف نے دیکھا کہ کوئی سند بھی ان کے کام نہیں آرہی تو انھوں نے اپنا عصا زور سے زمین پر مارا اور گرجدار آواز میں کہا ''بابا مستان شاہ جا رہا ہے، کل پھر اسی وقت آئے گا''۔ مگر کل میں ان کا انتظار ہی کرتا رہا، وہ تشریف نہیں لائے۔

اور آج جب میں یہ کالم لکھ رہا تھا تو اچانک مجھے یاد آیا کہ یہ تو وہی بابا مستان شاہ تھا جو تقریباً بارہ چودہ برس قبل ہم چند دوستوں کو ایک دفتر میں ملا تھا اور اس نے تقریباً یہی باتیں کی تھیں اور میں نے ''ریت کی دیواریں'' کے عنوان سے اس پر ایک کالم بھی لکھا تھا جس پر کئی قارئین کے خط مجھے آئے جس میں انھوں نے ان باباجی کی وہ کرامتیں بیان کیں کہ میں لرز کر رہ گیا تھا۔ آج بھی وہی مستان شاہ ہے، صرف عمر کے فرق نے اس کے خدوخال میں تھوڑی سی تبدیلی ہوئی ہے۔

ادویات کی قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں، مریض سسک سسک کر مر رہے ہیں، بیروزگاری کا عفریت کئی جوانوں کو ہڑپ کر چکا ہے، اوپر سے ''ڈاؤن سائزنگ'' کی تلوار لٹک رہی ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ یا اس کا عزیز شام کو بخیریت گھر واپس آئے گا کہ نہیں، آج بھی اگر کوئی شخص پریشان ہے اور پریشانی کے ان لمحات میں کوئی بابا مستان شاہ آپ کے پاس آتا ہے، فقیری چوغے میں ملبوس، گلے میں منکے پہنے ہوئے، ہاتھ میں درویشی عصا لیے اور کہتا ہے تمھاری پریشانی دور ہوگی ہر پریشان شخص کو ان کلمات کی ضرورت ہے۔ اور یوں بابا مستان شاہ بھی اس معاشرے کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈیمانڈ اینڈ سپلائی کے اصول کے عین مطابق اس وقت شہر میں ہزاروں کی تعداد میں مستان شاہ موجود ہیں۔ یہ نقلی مستان شاہ اس وقت تک ہمارے درمیان رہیں گے جب تک معاشرے کی پریشانیاں دور کرنے والا اصلی مستان شاہ نہیں آتا۔ البتہ ایک بابا مستان شاہ میں نے ناروے میں بھی دیکھا تھا۔ وہ یہ نہیں بتاتا تھا کہ آپ کی ہر پریشانی دور ہوگی، پریشانی آپ بتاتے تھے، دور وہ کرتا تھا۔ اگر کوئی بیمار پڑتا تھا تو بابا مستان شاہ اس کا علاج معالجہ کرتا تھا۔ اگر اسپتال میں داخلے کی ضرورت ہوتی تو وہ اسپتال میں بھی ایڈمٹ کرا دیتا تھا۔ ان خدمات کے عوض وہ آپ سے کوئی رقم طلب نہیں کرتا تھا بلکہ سب کچھ اپنے پلّے سے کرتا تھا۔ اگر آپ بے گھر ہوتے تو وہ آپ کو رہنے کے لیے گھر دیتا تھا، اگر آپ بیروزگار ہوتے تو روزگار پر لگنے تک وہ ہر ماہ آپ کو

ایک معقول رقم دیتا تھا۔ آپ کے ہاں بچہ پیدا ہوتا تو اس کا خرچ وہ اٹھانے لگتا تھا۔ ناروے کا بابا مستان شاہ آپ کی جان و مال کا بھی محافظ تھا۔ مجال ہے کوئی آپ کی طرف میلی آنکھ سے دیکھ بھی سکے۔ باباجی کی نگاہِ دور رس یہ بھی بھانپ لیتی تھی کہ کوئی آپ کی نجی زندگی میں مداخلت تو نہیں کر رہا، چنانچہ ایسے شخص سے باباجی خود نمٹ لیتے تھے۔

باباجی کا ایک عجیب و غریب کمال یہ تھا کہ وہ کسی کو نظر نہیں آتے تھے مگر ہر معاملے پر ان کی نظر ہوتی تھی۔ میں نے اسی طرح کے ایک باباجی کے بارے میں یہ بھی سنا تھا کہ وہ صرف ناروے نہیں سویڈن، ڈنمارک، فن لینڈ اور یو کے وغیرہ میں بھی پائے جاتے ہیں مگر وہاں بھی وہ کسی کو نظر نہیں آتے۔ بس ان کے کمالات نظر آتے ہیں۔ بالآخر مجھے پتا چلا کہ بابا مستان شاہ کسی شخص کا نام نہیں، یہ ان ملکوں کی فلاحی ریاست ہے جو اپنے باشندوں کے لیے ماں کا درجہ رکھتی ہے۔ ہمارے بابائے قوم قائداعظم نے بھی اسی قسم کی ریاست کا خواب دیکھا تھا مگر ان کے بعد آنے والے بیشتر حکمران وہ بابا مستان شاہ بن گئے جن سے ان دنوں ہر شہر، ہر گاؤں اور ہر قصبے میں ہماری ملاقات ہوتی ہے۔ ہمیں قائداعظم والے بابے کی ضرورت ہے۔ اگر وہ ہمارے درمیان پیدا ہو گیا اور کسی نے شب خون مار کر اسے رستے سے نہ ہٹایا تو پھر ہمیں کسی دوسرے ملک کی مثال دینے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ لوگ کہیں گے پاکستان کا بابا مستان شاہ دوسرے ملکوں کے مستان شاہوں سے بہت آگے ہے۔

غزلیں

احمد ندیم رفیع/امریکہ

صورتِ موجِ صبا آ کے گزر جاتے ہو
رنگ و خوشبو کا غضب ڈھا کے گزر جاتے ہو

میں تمہیں کون سے الفاظ کا جامہ پہناؤں
تم خیالوں میں بھی لہرا کے گزر جاتے ہو

یہ محبت ہے، لگاوٹ ہے، ادا ہے، کیا ہے
جب نظر آتے ہو شرما کے گزر جاتے ہو

دُور سے آتے ہو آنچل میں چھپائے خود کو
پاس آتے ہو تو سرکا کے گزر جاتے ہو

باندھ کر زلفِ رسا گھر سے نکلتے ہو مگر
میں نظر آؤں تو بکھرا کے گزر جاتے ہو

جب بلاتا ہوں بڑھا لیتے ہو رفتار اپنی
تھام لوں ہاتھ تو بل کھا کے گزر جاتے ہو

جب سرِ راہ جھکی پلکیں اُٹھاتے ہو تم
ایک پیمانہ سا چھلکا کے گزر جاتے ہو

سرِ بازار ٹھٹھک جاتے ہو چلتے ہوئے جب
اپنے پیچھے مجھے تڑپا کے گزر جاتے ہو

اتفاقاً میں کبھی سامنے آ جاؤں تو
میرے پہلو میں سے کترا کے گزر جاتے ہو

اس سے پہلے مری وحشت کا ہو چرچا ہر سو
اک نظر میں مجھے سمجھا کے گزر جاتے ہو

منتظر ہوں میں سرِ راہ وفا مدت سے
دو گھڑی آتے ہو بہلا کے گزر جاتے ہو

دھوپ کی پہلی کرن بن کے خنک موسم میں
میرے اعصاب کو گرما کے گزر جاتے ہو

تپتے صحرا میں اُمڈتے ہوئے بادل کی طرح
اپنے دیوانے کو ترسا کے گزر جاتے ہو

دُور تک پھیلی کڑی دھوپ کی شہ راہوں میں
ایک سائے کی طرح آ کے گزر جاتے ہو

درد کی بجھتی ہوئی آخری چنگاری کو
یاد آتے ہو تو بھڑکا کے گزر جاتے ہو

✧✧✧

شہرِ جنوں میں سنگِ ملامت بھی ساتھ ہے
عزمِ صمیم بھی ہے، ندامت بھی ساتھ ہے

سُوئے ابد رواں ہے جہاں موجۂ نشاط
غم ہائے زندگی کی قیامت بھی ساتھ ہے

تنہا نہیں ہے پیاس کے صحرا میں زندگی
ابرِ گریز پا کی علامت بھی ساتھ ہے

روشن ترے وصال کا سورج تو ہے کہیں
کیا جو شبِ فراق کی قامت بھی ساتھ ہے

سر پر جنونِ آبلہ پائی نہیں فقط
اک دشتِ خارزار کی شامت بھی ساتھ ہے

پائیں بقدرِ شوق نگہ ہائے التفات
خوش چشمگی میں حُسنِ نظامت بھی ساتھ ہے

منزل کی سمت چل تو پڑا ہوں مگر ندیم
لوحِ سفر پہ حرفِ اقامت بھی ساتھ ہے

✧✧✧

اشرف المشروبات

امجد محمود چشتی / میاں چنوں

چائے کو تمام مشروبات پر ڈھیروں فضیلتیں حاصل ہیں۔ یہ سیاسی، مذہبی اور سماجی تقریبات کی شان اور جزو لاینفک ہے۔ سرکاری اداروں میں تو جیسے SOPs کا حصہ ہے کہ احباب اپنے فرائض کی انجام دہی کریں یا نہ کریں، چائے نوشی کے ناغے کا تصور بھی ممکن نہیں۔ کسی مہمان یا آفیسر کی آمد کی صورت میں چائے کا آنا بھی ناگزیر ہو جاتا ہے۔ نہیں تو مہمان کی عزت افزائی اور آفیسر کے پروٹوکول پر حروف آنے کے اندیشے جنم لے سکتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ چائے کی بابت یاروں کا عقیدہ غالب کے آموں کی شکل ہے کہ چائے ہو، میٹھی ہو اور ڈھیر ساری ہو۔ چائے کے ادوار میں تو ایسے ذیابیطسی دوست بھی روبہ صحت نظر آتے ہیں جو اقاتِ کار میں شوگر اور امراضِ جگر و معدہ کا شکار ہوتے ہیں۔ جبکہ حکماء انہیں باور کرا چکے ہوتے ہیں کہ چائے کی پتی سے بندے کا جگر تک کٹ سکتا ہے۔ بعض دوست تو چائے کے ایسے رسیا ہوتے ہیں جیسے چائے کا چمچہ منہ میں لئے پیدا ہوئے ہوں۔ ایسے حضرات عُسرت میں بھی چائے کی کثرت کی حسرت سے مالا مال ہوتے ہیں۔ بر سبیل تذکرہ عرض ہے کہ سو سال قبل چائے ہماری خوراک کا حصہ ہرگز نہ تھی اور صرف اطِبّاء کے ہاں بطور دردکش (پین کلر) دوا دستیاب ہوتی تھی۔ شائد اسی لئے انگریزی میں چائے پینے کے عمل میں ،،ڈرنک ٹی،، کی بجائے ٹیک ٹی استعمال ہوتا ہے۔ اگر یہ پرانے دور میں اسی شان و شوکت سے پائی جاتی تو شعر و ادب کی دنیا میں ہمیں انگور کی بیٹی کے ساتھ ساتھ لپٹن و سپریم کے قصیدے بھی ملتے۔ ساغر و مینا کے ہمراہ کیتلی و کپ کے اذکار چلتے اور اکثر بسیار نوش شعراء شوگر اور پیلیا کے باعث مرتے۔ جہاں مئے خانوں کا ذکرِ خیر ہوتا تو ساتھ ہی ٹی ہاؤسز اور چائے کے کھوکھوں کے گن بھی گائے جاتے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ آج ٹی ہاؤسز، مئے خانوں کی جگہ لے چکے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مئے نوشی، مدہوشی کا موجب بنتی تھی جبکہ چائے سستی اور خمار کو بھگا کر کم خوابی کا باعث ہے۔ میر کے دور میں چائے ہوتی تو فرحت طبع کیلئے کہہ اٹھتے، چائے کو چاہئے دو منٹ اثر ہونے تک۔۔

اب معلوم ہوا کہ ساغر صدیقی اپنی تخلیقات چائے کی ایک پیالی کے عوض کیوں قربان کر دیتے تھے؟۔ اس لئے کہ وہ شعر و سخن کے ساتھ ساتھ بلا کے چائے شناس بھی تھے۔ چائے اگر کلاسیکل دور میں عام ہوتی تو شعراء کرام اپنے دور کے مفتیان اور زاہدان تنگ نظر کے عتاب کا شکار ہونے سے بھی محفوظ رہتے کیونکہ چائے انہیں خود مرغوب ہوتی۔ مگر غالب اپنی سچ گوئی اور اعترافی اسلوب میں تب بھی مانتے،

چائے نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

لیکن اب ماننا ہوگا کہ آج زندگی چائے کے بغیر ادھوری اور بے کیف ہے۔ اب یہ بات طے ہے کہ چائے اظہار محبت اور چاہت کا موثر ترین ذریعہ ہے۔ ہیر رانجھا اگر دور حاضر میں ہوتے تو ہیر چوری کے ہمراہ چائے کا تھرمس لئے رانجھے سے ملنے جاتی۔ ناراضگیاں اور گلے شکوے ایک کپ چائے سے دور ہو سکتے ہیں اور دوست چائے کے ساتھ ساتھ غصہ بھی پی سکتے ہیں۔ بقول شاعر

میرے پاس سے گزر کر مجھے چائے تک نہ پوچھی
میں یہ کیسے مان جاؤں کہ وہ دور جا کے روئے

اگر آپ چائے کے پینے پلانے کے گُر سے واقف ہیں تو بلا شبہ کامیاب انسان ہیں کیونکہ یہ حل المشکلات اور قاضی الحاجات بھی ثابت ہوتی ہے۔ پی جانے والی چائے سے ہٹ کر چائے پانی کی مال افزاء اصطلاح تو سونے پہ سہاگہ کی تاثیر رکھتی ہے، جس سے کام نہ نکلنے کی شرح کم ہو جاتی ہے۔ رشتوں کے دیکھنے دکھانے کے عمل میں بھی چائے کا ہی کلیدی کردار فرما ہوتا ہے۔ کسی کی ممی کسی کو چائے پہ بلاتی ہے تو کبھی کسی کے ممی پاپا چائے پہ بلائے جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں پھنسنے پھنسانے کی رومانوی سرگرمیاں بھی چائے کی مرہونِ منت ہیں۔ رت جگوں کیلئے تو ڈھیروں مفید ہے۔ پڑھاکو سٹوڈنٹس رات کو نیند کے غلبوں سے بچنے کیلئے چائے کا ہی سہارا لیتے ہیں۔ کچھ کی رائے میں چائے اس عدیم الفرصتی کے دور میں مل بیٹھنے اور پلیٹ جھپٹ کر ہو گرم رکھنے کا بہانہ ہے۔ بعض اسے اعصاب کا چابک کہتے ہیں جبکہ اہل دل کا عقیدہ ہے کہ چائے تو بس چائے ہی ہے بلکہ ان کا کہنا ہے کہ اس چاہ کو ذرا الو، چاہ میں جس چاہ، میں چاہ نہیں۔ گویا ان حالات میں سٹارم ان دی ٹی کپ کا محاورہ جوڑنا غلط نہ ہوگا۔ کہنے کو تو دورِ حاضر کا اہم ایشو پانی ہے جس کی بنیاد پر اقوام عالم میں جنگیں متوقع ہیں مگر چائے کی اہمیت کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ مستقبل میں چائے کے پینے پلانے پہ بھی جھگڑے ہوں۔ اس کی طلب و رسد، دستیابی اور تجارت کی بابت تنازعے ہوں۔ اور ماضی کی کولڈ وار کی مانند چائے کے ایشوز پہ کُزگ،، وارم وارز،، کی اصطلاح رائج ہو جائے اور،، storm in a tea cup،، کی عملی تعبیر بھی دیکھی جائے۔ دیکھیں تو دنیا کے سب سے بڑے دو جنون، سمارٹ فون اور چائے ہیں۔ تاہم چائے کے کچھ ایسے بھی ہیں جن میں خوش ذائقہ بسکٹوں کا چائے کی پیالی میں مفاجاتی انہدام اور کسی ناشتا ور کھی کی ناکام تیراکی وغیرہ شامل ہیں۔ اگر چائے نوشوں کو چائے کے مضر اثرات اور گرم مزاجی کا بتایا جائے تو فرماتے ہیں کہ چائے کے ہمراہ دیگر لوازمات یعنی بسکٹ وغیرہ کے تکلفات سے چائے معتدل ہو جاتی ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ دنیا کی عظیم نعمتوں میں چائے سرِ فہرست ہے اور اس کے دانے دانے پہ پینے والے کا نام تک لکھا ہوا ہے۔ بعض تو اس حوالے سے اندھی عقیدت رکھتے ہیں، بقول شاعر

ہم فقیروں کی طبیعت بھی غنی ہوتی ہے
بیٹھ جاتے ہیں جہاں چائے بنی ہوتی ہے

تمنا ہے کہ چائے جنت میں بھی میسر ہو مگر تاحال یہ مژدہ کسی عالم نے سنایا نہیں، پر ہم نے بڑوں سے سنا ہے کہ جنت میں جس چیز کی خواہش ہوگی اس کا ذائقہ نصیب ہوگا۔ گویا وہاں دودھ اور شہد کے ساتھ ساتھ چائے کی نہروں کی بھی حسب خواہش فراوانی ہوگی اور وہ بھی حوروں کی میزبانی میں۔ تو اب تسلیم کرنا ہی ہوگا کہ انسان اگر اشرف المخلوقات ہے تو چائے اشرف المشروبات ہے۔

منیر نیازی کی بذلہ سنجی

عامر بن علی/ جاپان

دسمبر اپنی سرد ہواؤں سمیت اپنا جوبن دکھا رہا ہے۔ یہ اردو اور پنجابی کے عہد ساز شاعر منیر نیازی کی رخصتی کا مہینہ بھی ہے۔ پندرہ سال پہلے یہ دسمبر کا ہی ایک سرد دن تھا جب یہ باکمال شاعر ہم سے جدا ہو گئے۔ منیر نیازی شعروسخن کا ایسا جاوداں حوالہ ہے جس کے بغیر ادب اور ہمارے عہد کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ جیسی باکمال اور غیر روایتی ان کی شاعری تھی ویسی ہی بے مثال اور پرکشش ان کی شخصیت تھی۔ ان جیسی گفتگو سننے کو میری طرح ان تمام احباب کے کان ترس گئے ہوں گے جن کی نیازی صاحب سے آشنائی تھی۔ پورا سچ بولتے تھے اور نفع ونقصان سے بے نیاز ہو کر اپنی بے لاگ رائے کا اظہار کرتے تھے۔ بقول شخصے بندہ ضائع کر دیتے تھے مگر جملہ ضائع نہیں کیا کرتے تھے۔ ان کی بذلہ سنجی پر باآسانی کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ ایسے زندہ دل اور خوشگوار آدمی کی برسی کے موقع پر بھی جی نہیں مانتا کہ سوگوار گفتگو کی جائے۔

رسیا آدمی تھے۔ جب جب بھی میں نے ان سے مشاعرے میں شرکت کی درخواست کی تو انہوں نے اعزازیے کا کبھی نہیں پوچھا، البتہ ''ام الخبائث'' کا کیا بندوبست ہے؟ یہ سوال کبھی کبھی پوچھ لیتے تھے۔ احمد ندیم قاسمی اور احمد فراز کو خصوصی طور پر ناپسند فرماتے تھے، جس کا سبب راقم کو معلوم نہیں ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ کوئی بھی آدمی انہیں مشکل سے ہی پسند آتا تھا۔ ان کے حاسدین، جن کی کوئی کمی نہیں تھی، انہیں ''مردم بیزار'' قرار دیتے تھے مگر یہ بات تو ماننے کی ہے کہ شاعر ہونے کی صورت میں کسی بھی آدمی کی نیازی صاحب کی نظر میں پسندیدگی کے امکانات انتہائی کم ہو جاتے تھے۔ ہمارے عہد کے ایک نامور شاعر کے بارے میں ان کا فرمان تھا کہ ''ایسا نامراد ہے کہ اپنی غیر موجودگی میں بھی لوگوں کا وقت ضائع کرتا ہے'' ایک نوآموز شاعر انہیں ایک دفعہ لاہور کے ایک چائنیز ریستوران میں لے گیا۔ شاید ان سے اپنی کتاب کا فلیپ لکھوانا چاہتا تھا۔ نیازی صاحب کے ہاں ایک ملاقاتی بھی اس وقت موجود تھا۔ انہیں بھی مروتاً نیازی صاحب ساتھ لے گئے تھے۔ کھانا کھایا جا چکا اور بل ادا کرنے کا وقت آیا تو میزبان شاعر نے اپنی جیبیں ٹٹولنے کے بعد اعلان کیا کہ اف! میں تو اپنا پرس ہی گھر بھول آیا ہوں۔ منیر نیازی نے ملاقاتی ساتھی کی طرف دیکھا تو جواباً اس نے بھی معذرت بھری نگاہ سے مسکرا کر دیکھا۔ جب نیازی صاحب کو یقین ہو گیا کہ اب چاروناچار کھانے کا بل انہیں ہی ادا کرنا ہے تو تو انہوں سے نوجوان شاعر کو مخاطب کر کے کہا کہ نانہجار! ایک تو تم شاعر انتہائی ماٹھے ہو اور اوپر سے اپنے ساتھ پرس بھی نہیں رکھتے ہو۔

اصل نام منیر احمد تھا مگر قلمی نام سے ہی شہرت دوام پائی۔ مشرقی پنجاب کے ضلع ہوشیار پور کے قصبے خانپور میں ولادت 1928 کو ہوئی۔ اور ابتدائی تعلیم بھی وہیں پر ہی حاصل کی تھی۔ ساہیوال کا ان دنوں منٹگمری نام ہوا کرتا تھا، پاکستان کے قیام سے بیشتر ہی یہاں منتقل ہو گئے تھے، میٹرک انہوں نے منٹگمری سے ہی کیا اور پھر انٹرمیڈیٹ کے لئے صادق ایجرٹن بہاولپور تشریف لے گئے۔ ایک ا، ہجرت کی تو لاہور آ گئے اور دیال سنگھ کالج سے BA پاس کیا۔ ان کی شاعری میں ہجرت کا استعارہ شاید اسی وجہ سے نمایاں نظر آتا ہے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ وہ اپنے سے بڑا شاعر کسی کو نا مانتے تھے اور معاصرین سے تو بالکل بھی متاثر نہیں ہوتے تھے۔ پچھلی صدی کے کسی بھی بڑے سے بڑے شاعر کے بڑے سے بڑے شعر پر ان کی زیادہ سے زیادہ داد، ٹھیک اے!! اچھا اے!! بس یہیں تک ہوا کرتی تھی۔ ان کے ادبی نظریے کا خلاصہ پیش کیا جائے تو وہ یوں تھا کہ کائنات کی تاریخ میں آج تک ایک ہی شاعر عظیم ہوا ہے اور اس کا نام منیر نیازی ہے۔ یہ بات ان کے منہ سے جچتی بھی تھی، چونکہ وہ تھے بھی فقید المثال، نابغہ روزگار۔ انتہائی خوبصورت آدمی تھے۔ باہر اور اندر سے اجلے اجلے۔ ظاہر اور باطن بالکل ایک جیسا روشن۔ بس ذرا غیر روایتی تھے۔ لنڈے کی گفتگو نہیں کیا کرتے تھے۔ جینوئن خیالات کا اظہار ان کا طرۂ امتیاز تھا۔

معاصرانہ چشمک شاعروں میں ایک قابل قبول عمل سمجھا جاتا ہے اور قابل فہم بھی ہے کسی حد تک۔ واقفان حال جانتے ہیں کہ لاہور کے ادبی منظرنامے پر ایک طویل عرصہ تک احمد ندیم قاسمی کا طوطی بولتا تھا۔ جس محفل میں بھی جاتیں کرسی صدارت ان کے لئے مختص رہتی۔ ریڈیو پاکستان کے ایک مشاعرے میں منیر نیازی تشریف لائے اور سیدھے جا کر کرسی صدارت پر بیٹھ گئے۔ چہ مگوئیاں ہوئیں اور امجد اسلام امجد سے مدد مانگی گئی، کہ وہ ان

بارے میں بات کریں۔ امجد صاحب نے جا کر منیر نیازی سے کہا کہ نیازی صاحب آپ جس کرسی پر براجمان ہیں وہ صاحب صدر کی ہے۔ اس پر نیازی صاحب نے پنجابی میں استفسار کیا کہ ''اوکون اے؟'' یعنی کہ صاحب صدر کون ہے؟ امجد صاحب نے جواب دیا کہ جناب احمد ندیم قاسمی۔ اس پر نیازی صاحب نے اپنے مخصوص لہجے میں پوچھا ''تے اوکون اے؟'' یعنی کہ وہ کون ہے؟ گویا احمد ندیم قاسمی کو جانتے ہی نہ ہوں۔ قاسمی صاحب کے عقیدت مندوں کا ایک وسیع حلقہ تھا، جس میں راقم الحروف بھی شامل ہے، ایک پورے عہد نے ان سے کسب فیض کیا۔ مگر منیر نیازی کا اس بابت قول تھا کہ ''احمد ندیم قاسمی برگد کا وہ گھنا درخت ہے جس کے سائے میں خبیث روحیں پلتی ہیں'' کبھی کبھی ان کی دراز عمری پر چوٹ کرتے ہوئے انہیں ''سدا بہار بوڑھا'' کا خطاب بھی دیتے تھے۔ یہ تو خیر بڑے لوگوں کی آپس کی باتیں ہیں میری نظر میں تو دونوں حضرات ہی عظیم شعراء اور بہترین انسان تھے۔

منو بھائی نے مجھے بتایا کہ منیر نیازی نے کالم نگاری کی کوشش بھی کی تھی۔ ان دنوں ''امروز'' ایک مقبول روزنامہ ہوا کرتا تھا۔ دیگر شاعر دوستوں کی دیکھا دیکھی جو کالم نگار بھی تھے، نیازی صاحب نے بھی کالم نگاری شروع کر دی۔ پہلے دن کے کالم میں جتنے لطیفے یاد تھے لکھ ڈالے۔ باقی جو لطیفے یاد تھے اگلے دن کے کالم میں وہ بھی لکھ دیے۔ اب تیسرے کالم کا ایک پیراگراف لکھنے کے بعد قلم آگے جا ہی نہیں رہا تھا۔ طویل سوچ بچار کے بعد انہوں نے رکشہ کروایا اور ریواز گارڈن میں واقع منو بھائی کے گھر یہ کالم لے کر پہنچ گئے۔ کہنے لگے یہ کالم مکمل کر دیں، آئندہ میں کبھی کالم نہیں لکھوں گا۔ ویسے وہ کالم نہ لکھنے کی وجہ یہ بتاتے تھے کہ کالم نگار تین، تین جگہ سے تنخواہ وصول کرتے ہیں۔ منو بھائی سے ان کی بڑی دوستی تھی۔ یہ بھی وجہ ہو سکتی تھی کہ دونوں کا نام منیر احمد تھا۔ ہم نام ہونے کے علاوہ ہم نوالہ و ہم پیالہ تھے۔ میاں چنوں مشاعرے پر بلایا تو رات دونوں ہمارے گھر کے ایک ہی کمرے میں ٹھہرے تھے۔ احمد فراز اور قاسمی صاحب ایک کمرے میں تھے قیام پذیر تھے۔

مشاعرے سے پہلے مشروب مغرب کی بوتل ہاتھ میں پکڑے ایک ایک لفظ غور سے پڑھ رہے تھے اور منو بھائی کے علاوہ جاوید شاہین کو سنا رہے تھے۔ اس ہدایت کے ساتھ کہ ڈاکٹر نے سخت منع کیا ہے۔ جاوید شاہین کا کہنا تھا کہ کیوں خود کو ترسا رہے ہو؟ مشاعرے کے اختتام پر منو بھائی اور منیر نیازی کو میں نے اپنی گاڑی میں بٹھایا، رات کے پچھلے پہر دونوں میں بحث چل رہی تھی کہ لاہور واپسی کا سفر ابھی اختیار کیا جائے یا پھر رات میاں چنوں میں قیام کیا جائے۔ منیر نیازی کا کہنا تھا ''منو بھائی تم نے ساری زندگی گھر کو گھر نہیں سمجھا'' حیرت انگیز طور پر منو بھائی کا یہ رویہ معذرت خواہانہ تھا کہ یار صبح اٹھ کر چلے جائیں گے، رات ادھر ہی سوتے ہیں۔ میں نے مصالحت کروانے کی کوشش کی اور درمیان کا راستہ تجویز کیا کہ جناب آپ دو، تین گھنٹے سو لیں، اس کے بعد چلے جایئے گا۔ اس پر نیازی صاحب ہنس کر بولے کہ یار!! ہم کوئی فوجی تھوڑی ہیں جو دو گھنٹے سوئیں؟ گیسٹ روم کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے انہوں نے میرے بڑے بھائی سے شکوہ کیا کہ آپ نے اتنا اچھا گھر بنایا ہے مگر سیڑھیاں ٹھیک نہیں ہیں۔ نیازی صاحب کے اس جملے کے پیش نظر بھانجان نے سیڑھیاں بعد ازاں نئی بنوا دیں مگر سیڑھیوں پر لڑکھڑانے کی وجہ کچھ اور تھی شاید۔

آخری عمر میں تخلیقی عمل رک سا گیا تھا۔ کسی نقاد نے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ منیر نیازی نے تو پچھلے سترہ سال میں ایک شعر بھی نہیں کہا، وہ کیسا شاعر ہے؟ اس کے جواب میں نیازی صاحب نے فرمایا کہ مرزا غالب نے تو پچھلے ڈیڑھ سو سال میں کوئی شعر نہیں کہا ہے، اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟ آخری مرتبہ ان سے ملنے گیا تو ذرا نیور کا شکوہ کرنے لگے کہ بڑا ''تھن ٹٹ'' ہے۔ میں نے اپنی کم علمی کا اعتراف کیا تو سمجھانے لگے کہ جس بچھڑے کو بھینس کا دودھ وقت سے پہلے چھڑوا دیا جاتا ہے، اس کی شخصیت پر پر تشدد اثرات کا تفصیلی بیان کر کے ''تھن ٹٹ'' سمجھایا۔ ایک چرب زبان شاعر کے تذکرے پر تبصرے کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ ہے تو رکشہ مگر ہارن اس نے ٹرک کا لگوا رکھا ہے۔ اسی متعلق پہلے کہہ چکے تھے کہ یہ ہیں تو کیچوے مگر انہوں نے سانپوں کی وردیاں پہن رکھی ہیں، یہ بھی کہ اگر سانپ کا زہر نکل جائے تو کیچوا ہی رہ جاتا ہے مگر منیر نیازی نے مجھے بتایا کہ میرے متعلق زیادہ تر واقعات اور منسوب جملے لوگوں نے خود گھڑے ہیں۔ ان کی بات سچ بھی مان لی جائے تو ان جیسا جملے باز اور بذلہ سنج کم از کم میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

شاعری

آنکھیں ہیں شعلہ بار تو الفاظ ہیں کرخت
ماحول اس مکان کا کیسا ہوا ہے سخت
بیٹھے گا اس پہ کیسے بھلا پھول سا بدن
اس شہرِ اقتدار میں کانٹوں بھرا ہے تخت
سڑکوں کے آس پاس نہیں دھوپ سے پناہ
شہتیر بن گئے ہیں میرے گاؤں کے درخت
یاروں نے گاؤں چھوڑ کے چولے بدل لیے
میں نے بھی آ کے شہر میں بدلا ہے ساز و رخت
الفاظ کے گہر سے میں دست و قلم ہوا
محنت سے اس غریب کا یاور ہوا ہے بخت
کشتی کے باقیات نے مجھ کو بچا لیا
ثاقب بہا تھا ساتھ مرے اس کا لخت لخت

آصف ثاقب/بوئی (ہزارہ)

ہوائے تیز ترا ایک کام آخری ہے
کہ نخلِ خشک پہ ماہ تمام آخری ہے
میں جس سکون سے بیٹھا ہوں اس کنارے پر
سکوں سے لگتا ہے میرا قیام آخری ہے
پھر اس کے بعد یہ بازار دل نہیں لگنا
خرید لیجئے صاحب غلام آخری ہے
گزر چلا ہوں کسی کو یقیں دلاتا ہوا
کہ لوحِ دل پہ رقم ہے جو نام آخری ہے
تبھی تو پیڑ کی آنکھوں میں چاند بھر آیا
کسی نے کہہ دیا ہوگا کہ شام آخری ہے
یہ لگ رہا ہے محبت کے پہلے زینے پر
کہ جس مقام پہ ہوں یہ مقام آخری ہے
کسی نے پھر سے کھڑے کر دیے در و دیوار
خیال تھا کہ مرا انہدام آخری ہے
ہمارے جیسے وہاں کس شمار میں ہوں گے
کہ جس قطار میں مجنوں کا نام آخری ہے
شروع عشق میں ایسی اداسیاں تابش
ہر ایک شام یہ لگتا ہے شام آخری ہے

عباس تابش/لاہور

اتنا آساں نہیں مسند پہ بٹھایا گیا میں
شہرِ تہمت تری گلیوں میں پھرایا گیا میں
میرے ہونے سے یہاں آئی ہے پانی کی بہار
شاخِ گریہ تھا سرِ دشت لگایا گیا میں
یہ تو اب عشق میں جی لگنے لگا ہے کچھ کچھ
اس طرف پہلے پہل گھیر کے لایا گیا میں
خوب اتنا تھا کہ دیوار پکڑ کر نکلا
اس سے ملنے کے لیے صورتِ سایہ گیا میں
تجھ سے کچھ کہنے کی ہمت ہی نہیں تھی ورنہ
ایک مدت تری دہلیز تک آیا گیا میں
خلوت خاص میں بلوانے سے پہلے تابش
عام لوگوں میں بہت دیر بٹھایا گیا میں

عباس تابش/لاہور

منزلِ وصل ہے کیا، خود سے جدا ہو جانا
خلوت گُل کا ہے خوشبو میں ہوا ہو جانا
شعلۂ لمس ہے شاموں کا سندھوری ہونا
باغِ دیدار ہے پیڑوں کا ہرا ہو جانا
جسم کی راکھ ہے اس چشم سیہ کا کاجل
عشوۂ خوں ہے ہتھیلی پہ حنا ہو جانا
کیمیا گر ہے کوئی چھوتے ہی جس کو دل کا
اور کچھ اور سے، اور کیا سے ہے کیا ہو جانا
سامنے پھر وہی دن پھر وہی دنیا کا ہجوم
اے مرے سائے قریب اور ذرا ہو جانا
آہ و فریاد کا ڈھل جانا مناجاتوں میں
ظلم کا شہرِ ستم میں ہے روا ہو جانا
دن میں روزن بنے اک شخص کا رستہ تکنا
شام ان آنکھوں کی لو کو ہے دیا ہو جانا
کیسے خوش فہم ہیں ہم شغلِ سخن سے سرمد
کب میسر ہوا خلقت کا بھلا ہو جانا

سرمد صہبائی/امریکا

آدمی خوار بھی ہوتا ہے نہیں بھی ہوتا
عشق آزار بھی ہوتا ہے نہیں بھی ہوتا
یہ جو کچھ لوگ خیالوں میں رہا کرتے ہیں
ان کا گھر بار بھی ہوتا ہے نہیں بھی ہوتا
زندگی سہل پسندی میں بسر کر لینا
کار دشوار بھی ہوتا ہے نہیں بھی ہوتا
کار دنیا ہی کچھ ایسا ہے کہ دل سے ترا درد
سلسلہ وار بھی ہوتا ہے نہیں بھی ہوتا
شادی و مرگ نے یہ نکتہ بتایا ہے کہ وقت
تیز رفتار بھی ہوتا ہے نہیں بھی ہوتا
افضل اور قیس نے قانون بنایا ہے کہ عشق
دوسری بار بھی ہوتا ہے نہیں بھی ہوتا

افضل خان/بہاولپور

تبھی تو میں محبت کا حوالاتی نہیں ہوتا
یہاں اپنے سوا کوئی ملاقاتی نہیں ہوتا
گرفتارِ وفا رونے کا کوئی ایک موسم رکھ
جو نالہ روز بہہ نکلے وہ برساتی نہیں ہوتا

CS CamScanner

بچھڑنے کا ارادہ ہے تو مجھ سے مشورہ کر لو
محبت میں کوئی بھی فیصلہ ذاتی نہیں ہوتا
تمہیں دل میں جگہ دی تھی نظر سے دور کیا کرتے
جو مرکز میں ٹھہر جائے مضافاتی نہیں ہوتا

افضل خان/ بہاولپور

ایک تاریخ مقرر پہ تو ہر ماہ ملے
جیسے دفتر میں کسی شخص کو تنخواہ ملے
رنگ اکھڑ جائے تو ظاہر ہو پلستر کی نمی
قہقہہ کھود کے دیکھو تو تمہیں آہ ملے
جمع تھے رات مرے گھر ترے ٹھکرائے ہوئے
ایک درگاہ پہ سب راندۂ درگاہ ملے
میں تو اک عام سپاہی تھا حفاظت کے لئے
شاہ زادی یہ ترا حق تھا تجھے شاہ ملے
ایک اداسی کے جزیرے پہ ہوں اشکوں میں گھرا
میں نکل جاؤں اگر خشک گزر گاہ ملے
اک ملاقات کے ٹلنے کی خبر ایسے لگی
جیسے مزدور کو ہڑتال کی افواہ ملے
گھر پہنچنے کی نہ جلدی نہ تمنا ہے کوئی
جس نے ملنا ہو مجھے آئے سر راہ ملے

عمیر نجمی/ رحیم یار خان

بڑے تحمل سے رفتہ رفتہ نکالنا ہے
بچا ہے جو تجھ میں میرا حصہ نکالنا ہے
یہ روح برسوں سے دفن ہے تم مدد کرو گے
بدن کے ملبے سے اس کو زندہ نکالنا ہے
نظر میں رکھنا کہیں کوئی غم شناس گاہک
مجھے سخن بیچنا ہے خرچہ نکالنا ہے
نکال لایا ہوں ایک پنجرے سے اک پرندہ
اب اس پرندے کے دل سے پنجرہ نکالنا ہے
یہ تیس برسوں سے کچھ برس پیچھے چل رہی ہے
مجھے گھڑی کا خراب پرزہ نکالنا ہے
خیال ہے خاندان کو اطلاع دے دوں
جو کٹ گیا اس شجر کا شجرہ نکالنا ہے
میں ایک کردار سے بڑا تنگ ہوں قلم کار
مجھے کہانی میں ڈال غصہ نکالنا ہے

عمیر نجمی/ رحیم یار خان

تم نے بھی ان سے ہی ملنا ہوتا ہے
جن لوگوں سے میرا جھگڑا ہوتا ہے
اس کے گاؤں کی ایک نشانی یہ بھی ہے
ہر نلکے کا پانی میٹھا ہوتا ہے
میں اس شخص سے تھوڑا آگے چلتا ہوں
جس کا میں نے پیچھا کرنا ہوتا ہے
تم میری دنیا میں بالکل ایسے ہو
تاش میں جیسے حکم کا اِکّا ہوتا ہے
کتنے سوکھے پیڑ بچا سکتے ہیں ہم
ہر جنگل میں لکڑہارا ہوتا ہے

ضیا مذکور/ رحیم یار خان

ماحول مناسب ہو تو اوپر نہیں جاتے
ہم تازہ گھٹن چھوڑ کے چھت پر نہیں جاتے
دیکھو مجھے اب میری جگہ سے نہ ہلانا
پھر تم مجھے ترتیب سے رکھ کر نہیں جاتے
بدنام ہیں صدیوں سے ہی کانٹوں کی وجہ سے
عادت سے مگر آج بھی کیکر نہیں جاتے
جس دن سے شکاری نے ادا کی کوئی منت
دربار پہ اس دن سے کبوتر نہیں جاتے
سو تم مجھے حیرت زدہ آنکھوں سے نہ دیکھو
کچھ لوگ سنبھل جاتے ہیں سب مر نہیں جاتے

دانش نقوی

وہ پاس گیا ذرا سا مسکرا کے بیٹھ گیا
میں اس مذاق کو دل سے لگا کے بیٹھ گیا
جب اس کی بزم میں دار و رسن کی بات چلی
میں جھٹ سے اٹھ گیا اور آگے آ کے بیٹھ گیا
درخت کاٹ کے جب تھک گیا لکڑ ہارا
تو اک درخت کے سائے میں جا کے بیٹھ گیا
تمہارے در سے میں کب اٹھنا چاہتا تھا مگر
یہ میرا دل ہے کہ مجھ کو اٹھا کے بیٹھ گیا
جو میرے واسطے کرسی لگایا کرتا تھا
وہ میری کرسی سے کرسی لگا کے بیٹھ گیا
پھر اس کے بعد کئی لوگ اٹھ کے جانے لگے
میں اٹھ کے جانے کا نسخہ بتا کے بیٹھ گیا

زبیر علی تابش

رات یہ کون مرے خواب میں آیا ہوا تھا
صبح میں وادیٔ شاداب میں آیا ہوا تھا
اک پرندے کی طرح اڑ گیا کچھ دیر ہوئی
عکس اس شخص کا تالاب میں آیا ہوا تھا
میں بھی اس کے لیے بیٹھا رہا چھت پر شب بھر
وہ بھی میرے لیے مہتاب میں آیا ہوا تھا
سرد خطے میں سلگتا ہوا جنگل تھا بدن
آگ سے نکلا تھا برفاب میں آیا ہوا تھا
یہ تو صد شکر خیالوں نے ترے کھینچ لیا
میں تو حالات کے گرداب میں آیا ہوا تھا
یاد ہیں دل کو محبت کے شب و روز حسن
گاؤں جیسے کوئی سیلاب میں آیا ہوا تھا

حسن عباسی/ لاہور

علی رضا کا نعتیہ مجموعہ ''درود پڑھتے ہوئے''

حسن عباسی/لاہور

نعت دراصل عقیدت، محبت اور حضور اکرم ﷺ کے ساتھ وابستگی کا سب سے حسین اظہار ہے۔ اردو شاعری میں جب بھی نعت لکھی گئی ہے، اس نے دلوں کو نرم کیا، روحوں کو روشنی بخشی اور ایمان کو تازگی عطا کی۔ شاعر علی رضا نے اپنے نعتیہ مجموعہ میں اسی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ ان کے اشعار میں حضور اکرم ﷺ کی ذات والاصفات کی مدحت بھی ہے، عشق کا اظہار بھی، اور امت مسلمہ کے لیے رہنمائی کا پیغام بھی۔

یہ مجموعہ محض الفاظ کی ترتیب نہیں بلکہ دل کی دھڑکنوں کی بازگشت ہے۔ جس طرح شاعر نے کہا ہے:

نرغۂ کفر سے انساں کی رہائی کے لیے
آپ آئے ہیں زمانوں کی بھلائی کے لیے

یہ شعر اس حقیقت کا ترجمان ہے کہ حضور ﷺ کی آمد بنی نوع انسان کے لیے سراپا رحمت ثابت ہوئی۔ دنیا کے ظلمت کدوں میں نور پھیلا، انسانیت کو جبر سے نجات ملی اور فلاح وہدایت کا راستہ روشن ہوا۔

اسی طرح شاعر نے درِ رسول ﷺ کی حقیقت کو نہایت خوبصورتی سے اجاگر کیا ہے:

''درِ رسول پہ آؤ تو یہ خیال رہے
یہ دشمنی کا نہیں دوستی کا مرکز ہے''

یہ پیغام اس در کی شان کے عین مطابق ہے، جہاں صرف امن، محبت اور اخوت کے چشمے بہتے ہیں۔ علی رضا نے گویا قاری کو متوجہ کیا ہے کہ نعت محض الفاظ کا حسن نہیں بلکہ ایک رویہ اور طرزِ زندگی ہے، جس کی بنیاد محبتِ رسول ﷺ ہے۔

کتاب ''درود پڑھتے ہوئے میں'' میں جابجا وہ سادگی اور اخلاص جھلکتا ہے جو سچے نعت گو شعرا کی پہچان ہے۔ شاعر کے کلام میں تصنع یا بناوٹ نہیں، بلکہ دل کی وہ مٹھاس ہے جس کے بغیر نعت اپنی روحانی تاثیر کھو دیتی ہے۔ جیسا کہ وہ خود اعتراف کرتے ہیں:

''سبق یہ سرورِ کونین کا دیا ہوا ہے
اگر زباں میں حلاوت نہیں تو کچھ بھی نہیں''

یہ اشعار بتاتے ہیں کہ نعت دراصل دل کی کیفیت کا نام ہے، اگر دل عشق سے خالی ہو تو لفظ بے جان رہ جاتے ہیں۔

نعت نگاری کے اپنے آداب اور تقاضے ہوتے ہیں۔ علی رضا نے ان کا نہ صرف خیال رکھا ہے بلکہ کمال مہارت اور دل کی سچائی سے انہیں برتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں محبت بھی ہے، ادب بھی، اور سچائی کی وہ روشنی بھی جو نعت کو محض شاعری سے بلند کر کے عبادت بنا دیتی ہے۔

ان کے کلام میں سب سے نمایاں بات ادبِ مصطفیٰ ﷺ کا رنگ ہے۔ شاعر نے دل کو آدابِ نعت میں ڈھال کر کلام کو تخلیق کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''میں نے دل کو ادب آداب میں رکھا ہوا ہے
نعت کے قریۂ شاداب میں رکھا ہوا ہے''

یہ شعر دراصل نعت کے بنیادی اصول کی وضاحت کرتا ہے کہ جو دل ادب میں تر نہیں، اس سے نعت کے پھول کبھی نہیں کھل سکتے۔ علی رضا نے اپنے کلام کو اسی ادب کی خوشبو سے معطر کیا ہے۔

پھر ان کا ایک اور شعر دیکھیے، جو عشق کی گہرائی اور اثر آفرینی کی مثال ہے:

''وہ اثر دل میں لیے پھرتا ہوں خوشبو کی طرح
اُن کی چاہت کے جو ہر باب میں رکھا ہوا ہے''

یہاں شاعر نے محبت رسول ﷺ کو خوشبو سے تشبیہ دی ہے، جو ہر سمت پھیلتی ہے اور دلوں کو مہکا دیتی ہے۔ نعت گوئی کی یہ خوبصورتی ہے کہ وہ قاری کے احساسات کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔

اسی طرح شاعر کے تخیل کی رفعت اور عقیدت کی شدت ان اشعار میں جھلکتی ہے:

''عکس لگتا ہے رضا حُسنِ شہِ بطحا کا
جو اُجالا رخِ مہتاب میں رکھا ہوا ہے''

مزید برآں، علی رضا کے کلام میں وہ شانِ رحمت بھی نمایاں ہے جس کی بشارت قرآن نے دی ہے۔ شاعر کا دل اپنی وحشتوں میں بھی یہی سہارا ڈھونڈتا ہے:

''غموں کی دھوپ میں وحشت کی بے کرانی میں
نبی کا بابِ عطا سائبانِ رحمت ہے''

یہ شعر امید، سکون اور پناہ کا اعلان ہے۔ شاعر نے زندگی کی سختیوں میں بھی حضور ﷺ کے وسیلے کو سایۂ رحمت پایا۔ اسی کیفیت کو وہ ایک اور شعر میں یوں ادا کرتے ہیں:

''رکھا ہے اُس نے ہمیشہ مجھے پناہوں میں
جو سر پہ سایہ فگن آسمانِ رحمت ہے''

یہ اشعار قاری کے دل میں سکون اور شکر کی کیفیت پیدا کرتے ہیں، اور یاد دلاتے ہیں کہ نعت محض الفاظ نہیں بلکہ دل کا سہارا ہے۔

آخر میں شاعر نے حضور ﷺ کی عظمت اور ان کے اسوہ کی جامعیت کو نہایت سادہ اور مؤثر لفظوں میں بیان کیا ہے:

''حضور! آپ نے بخشا وقار انساں کو
حضور! آپ کا اُسوہ جہانِ رحمت ہے''

یہاں شاعر نے نعت کو صرف عقیدت تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے عملی زندگی سے جوڑ دیا ہے۔ حضور ﷺ کا اسوہ ہی دراصل وہ چراغ ہے جو

CamScanner

انسان کو وقار بخشتا ہے اور جہان کو رحمت سے بھر دیتا ہے۔ جی! بہت خوبصورت اشعار ہیں۔ علی رضا کی نعتیہ شاعری میں وہی عشق وعقیدت کا رنگ جھلکتا ہے جو دل کو نرم بھی کرتا ہے اور روشنی بھی بخشتا ہے۔ کتاب درود کے یہ اشعار بتاتے ہیں کہ شاعر نے اپنی زبان کو مدحتِ رسول ﷺ کے رنگ میں رنگا ہے

یہاں شاعر نے نعت کو باغ سے تشبیہ دی ہے، جس میں ادب کا پانی اور عشق کی روشنی بہہ رہی ہے۔

اسی طرح وہ مدحتِ رسول ﷺ کے انوکھے رنگ کا ذکر کرتے ہیں:

''سخن میں مدحتِ سرکار کا ہے رنگ جدا
ثنائے سید ابرار کا ہے رنگ جدا''

یہ اشعار ظاہر کرتے ہیں کہ نعت گوئی عام شاعری نہیں، بلکہ ایک الگ شان اور الگ سرور رکھتی ہے۔ نعت کے مضامین دنیا کی ہر صنفِ سخن سے جدا ہیں، کیونکہ یہ کلام اس ذات کے ذکر میں ڈھلتا ہے جو کائنات کے لیے رحمت بن کر آئے۔

پھر شاعر حضور ﷺ کی عظمت کا ایسا نقشہ کھینچتے ہیں جس میں ان کا مقام بھی جھلکتا ہے اور اُن کا وصف بھی:

''کیسا عالی مقام ہے اُن کا
وصف خیر الا نام ہے اُن کا''

یہ شعر حضور ﷺ کی شانِ رفیع اور بلند مرتبے کی طرف اشارہ ہے۔ شاعر نے بڑے اختصار میں وہ عقیدہ بیان کردیا ہے جو ہر مسلمان کے دل میں رچا بسا ہے۔

علی رضا کی نعت میں سب سے نمایاں پہلو ان کا ذاتی جذبہ ہے۔ وہ مدحتِ رسول ﷺ میں اپنا دل اور اپنی کیفیت شامل کرتے ہیں۔ وہ اعتراف کرتے ہیں کہ نعت میں جو کچھ لکھا گیا، وہ ان کی کیفیت قلبی کی جھلک ہے:

''جو مری نعت میں رقم ہوا ہے
حال دل کا یہ چشم نم ہوا ہے''

یہاں شاعر نے نعت کو اپنی آنکھوں کے آنسوؤں سے جوڑ دیا ہے، گویا ہر شعر ایک قطرہ ہے جو عشق کی جھیل سے ٹپکا ہے

یہاں تک علی رضا کے کلام سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ''درود پڑھتے ہوئے'' محض نعتیہ اشعار کا مجموعہ نہیں بلکہ عاشقانہ کیفیات کا آئینہ ہے۔ شاعر نے اپنی زبان کو ادب میں ڈھالا ہے، اپنی آنکھوں کو آنسوؤں کی تسبیح بنایا ہے اور اپنے دل کو عشقِ رسول ﷺ کا مرکز بنا دیا ہے۔

بحضور امام عالی مقام

شہزاد دیپ/ جھنگ

وہ ایک راستہ جو کربلا کو جاتا ہے
یقین کیجیے وہ ہی خدا کو جاتا ہے

نجات اُس کے لیے راستے بناتی ہے
کہ جو حسینیت کو راستہ بناتا ہے

نوید ہے تو اُسی کو ہے باغِ جنت کی
غمِ حسینؑ کہ جس دل کو راس آتا ہے

وہ جنگ خیموں کی پانی کی نہ حکومت کی
یہ وہ سبق تھا کہ جو انقلاب لاتا ہے

جو آئے، آئے، نہ آئے تو اس کی مرضی ہے
حسینؓ آج بھی خیمہ وہیں لگاتا ہے

حسینؓ کر گیا، کرنا بھی یہ حسینؓ کو تھا
بھلا بتاؤ تو مقتل کوئی سجاتا ہے

غزلیں/لبنیٰ صفدر، لاہور

شعلہ جلتا ہوا سرد سی شام میں
من پگھلتا ہوا سرد سی شام میں

وحشتوں نے رگ جاں کو کاٹا ہے خوب
دکھ مسلتا ہوا سرد سی شام میں

آسمانوں پہ رنگوں کے میلے بھی تھے
دن تھا ڈھلتا ہوا سرد سی شام میں

کون تھا دشت میں سنگ میرے کہو
ساتھ چلتا ہوا سرد سی شام میں

بے خودی کو کہوں کیا میں اپنا بدن
دیکھوں ڈھلتا ہوا سرد سی شام میں

پوروں پوروں زخم ہوئی ہوں
خوابوں کی سیڑھی سے گری ہوں

کاسہ مرا ہے حرف تسلی
کرم کا سکہ مانگ رہی ہوں

سائے میں اس کے بیٹھنا چاہوں
صدیوں سے میں تھکی ہوئی ہوں

راہ کے جس نے خار چنے تھے
دل سے اس کی آج ہوئی ہوں

چہرے پر ہے گرد کا شیشہ
اندر سے میں چمک رہی ہوں

محبت: مشرق ومغرب کی ازلی داستان

لبنیٰ صفدر/ لاہور

محبت وہ جذبہ ہے جسے انسانی روح کا سب سے قدیم اور سب سے تازہ ترگیت کہا جاسکتا ہے۔ یہ نہ صرف انسان کو انسان سے جوڑتی ہے بلکہ اُسے کائنات اور اُس کے خالق سے وابستہ کر دیتی ہے۔ مشرقی صوفی شعرا اور مغربی کلاسیکی وجدید ادبا، دونوں نے اپنی اپنی تہذیب اور فکر کے رنگ میں محبت کو بیان کیا۔ مگر حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان سب کے ہاں محبت ایک ہی ازلی حقیقت کے طور پر جلوہ گر ہوئی، کبھی وصال کی صورت، کبھی جدائی کی تڑپ میں، اور کبھی کائنات کے محرک اصول کے طور پر۔

محبت صوفیا کے نزدیک محض انسانی جذبہ نہیں بلکہ ایک ازلی سچائی ہے جو خالق اور مخلوق کے درمیان ربط کا ذریعہ ہے۔ ان کے نزدیک عشق وہ چراغ ہے جو دل کو روشن کرتا ہے اور وہ شعلہ ہے جو نفس کو جلا کر روح کو پاکیزہ بنا دیتا ہے۔ صوفی شعرا نے محبت کو کبھی خدا تک رسائی کا زینہ، کبھی فنا میں بقا کا راستہ، اور کبھی روحانی سفر کا واحد وسیلہ قرار دیا ہے۔

مولانا جلال الدین رومی نے کہا:

عشق آمد و آتش بہ دل افروخت
ہر ذرۂ من عشق خدا سوخت

(محبت آئی اور دل میں آگ لگ گئی، میرے وجود کا ہر ذرہ عشق خدا میں جل اٹھا۔)

رومی کے نزدیک کائنات کی تخلیق ہی عشق کے سبب ہوئی، اور انسان کی نجات بھی اسی عشق کے ذریعے ممکن ہے۔ ان کا ماننا تھا کہ جب تک انسان اپنے نفس سے آزاد نہیں ہوتا، وہ عشق کے دروازے پر نہیں پہنچ سکتا۔

حافظ شیرازی نے عشق کو ساقی اور مے کے استعاروں میں بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں:

الا یا ایها الساقی ادر کاساً و ناولها
که عشق آسان نمود اول ولی افتاد مشکل ها

(اے ساقی! جام بڑھا کہ عشق ابتدا میں آسان دکھائی دیتا ہے مگر آگے جا کے مشکلات آتی ہیں۔)

یہاں حافظ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ عشق ایک کٹھن سفر ہے جس میں صبر اور قربانی کی ضرورت ہے۔

پنجاب کے عظیم صوفی شاعر بابا فرید نے محبت کو جدائی اور تڑپ کے استعارے میں بیان کیا۔ ان کے نزدیک عشق کی آگ ہر شے کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے:

فریدا عشق اندر سبھ کوئی کرے
عشق نہ دیساں ہوئے
جیوں جیوں عشق اگا ہے
تیوں تیوں آتھم ہوئے

(اے فرید! ہر کوئی دعویٰ کرتا ہے کہ وہ محبت کرتا ہے، مگر جب عشق کی آگ جلتی ہے تو سب کچھ جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔)

بلھے شاہ نے عشق کو روحانی انقلاب کی علامت قرار دیا۔ ان کے نزدیک عشق انسان کو موت کے خوف سے آزاد کر دیتا ہے:

بلھے شاہ اساں مرنا ناہیں
گور پیا کوئی ہور ہے

(اے بلھے شاہ! ہم نے مرنا نہیں، قبر کسی اور کے لیے ہے۔)

یہ شعر اس بات کا اعلان ہے کہ سچا عاشق فنا سے نہیں ڈرتا، کیونکہ وہ عشق میں ابدیت پا لیتا ہے۔

سلطان باہو نے محبت کو دل کی پاکیزگی کے ساتھ جوڑا۔ ان کا کہنا تھا کہ جب تک دل میں اللہ کے عشق کے سوا کچھ اور ہے، وصال ممکن نہیں:

باہو عشق اللہ ہُو دا دل اندر کر پردہ
جے دل اندر دوجا ہووے تے رب ناں لبھدا پردہ

(اے باہو! دل میں صرف اللہ کا عشق رکھ، اگر دل میں کوئی دوسرا آ گیا تو خدا نہیں ملتا۔)

شاہ عبداللطیف بھٹائی نے اپنی شاعری میں محبت کو جدائی اور ہجر کی کیفیت میں بیان کیا۔ ان کے نزدیک محبت دکھ سہنے کا دوسرا نام ہے:

سچوں سجن ملاوے، جنھاں دیاں نیتاں صاف
درداں دے وچ رہندے، اوہنوں لبھن عاف

(سچا محبوب انہی کو ملتا ہے جن کی نیت صاف ہو؛ دکھ سہنے والے ہی سکون پاتے ہیں۔)

یہی پیغام ہمیں سچل سرمست کے کلام میں بھی ملتا ہے، جنہوں نے کہا کہ محبت کا راستہ عقل نہیں، بلکہ دل ہے۔ ان کے نزدیک عشق عقل کے بنائے ہوئے سارے پیمانے توڑ دیتا ہے اور انسان کو وحدت تک لے جاتا ہے۔

یوں صوفیہ کے ہاں محبت انسانی زندگی کا سب سے اعلیٰ مقصد ہے۔ یہ محبت کبھی انسان اور انسان کے درمیان پل بن کر آتی ہے، کبھی محبوبِ حقیقی تک پہنچنے کا وسیلہ بنتی ہے۔ صوفیانہ شاعری میں عشق کو ہمیشہ ایثار، قربانی، جدائی اور وصال کے استعاروں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ان سب کے کلام میں ایک ہی صدا گونجتی ہے: محبت ہی وہ واحد قوت ہے جو انسان کو اس کی اصل حقیقت، یعنی اپنے رب سے ملا سکتی ہے۔

صوفی شعرا کی شاعری میں محبت کائنات کی

CS CamScanner

روح اور انسان کی معراج ہے۔ یہ نہ صرف انسان کے دل کو وسعت دیتی ہے بلکہ اسے نفس کی قید سے آزاد کر کے خالق سے جوڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام صدیوں بعد بھی دلوں کو گرما دیتا ہے اور روح کو بیدار کرتا ہے۔ صوفیہ کے نزدیک محبت ازل سے ہے اور ابد تک باقی رہے گی۔ کیونکہ یہی وہ قوت ہے جو ہر پردہ ہٹا کر حقیقت کو آشکار کرتی ہے۔

یورپی ادب کی تاریخ پر نگاہ ڈالیں تو یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ محبت ہمیشہ سے اس کا مرکزی موضوع رہا ہے۔ کبھی یہ ایک روحانی سفر کے طور پر سامنے آتی ہے، کبھی المیہ داستان کے طور پر، اور کبھی ایک نفسیاتی کشمکش کی صورت میں۔ یورپ کے بڑے شاعر اور ادیب محبت کو محض ایک ذاتی جذبہ نہیں سمجھتے بلکہ اسے کائنات کی سب سے بڑی قوت، انسان کی تخلیقی توانائی اور اس کی داخلی جدوجہد کا آئینہ دار قرار دیتے ہیں۔

دانتے الیگیری (Dante Alighieri) روحانی محبت

اطالوی شاعر دانتے نے اپنی شہرہ آفاق تخلیق The Divine Comedy میں بیاتریس (Beatrice) کی محبت کو مرکزی حیثیت دی۔ بیاتریس اس کے لیے صرف ایک محبوبہ نہیں بلکہ ایک روحانی رہنما ہے جو اسے جنت اور خدا کی طرف لے جاتی ہے۔ دانتے کے نزدیک محبت صرف ایک ذاتی رشتہ نہیں بلکہ خدا تک پہنچنے کا زینہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری میں بیاتریس کا کردار ایک فرشتے کی طرح جلوہ گر ہوتا ہے۔

پیٹرآرک (Petrarch) رومانوی اور لطیف عشق

پیٹرآرک کو یورپ کا سب سے بڑا "محبت کا شاعر" کہا جاتا ہے۔ اس کے سونٹس (Sonnets to Laura) میں اس نے لارا نامی عورت کے لیے اپنی محبت کو انتہائی لطیف اور حسین انداز میں بیان کیا۔ پیٹرآرک کا کمال یہ ہے کہ اس نے عشق کو محض جذباتی یا جسمانی سطح پر نہیں دیکھا بلکہ اسے ایک داخلی اور روحانی ارتقا کا ذریعہ سمجھا۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ میں "پیٹرآرکن محبت" (Petrarchan Love) ایک اصطلاح بن گئی۔

ولیم شیکسپیئر (William Shakespeare) محبت کی لازوال داستانیں

شیکسپیئر محبت کا سب سے بڑا ڈرامہ نگار اور شاعر ہے۔ اس کے ڈرامے "Romeo and Juliet" محبت کی لازوال کہانی ہے، جو دکھاتی ہے کہ عشق سماج کی رکاوٹوں اور نفرتوں سے لڑتے ہوئے کیسے قربانی اور المیے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے Sonnets میں محبت کو وقت کے خلاف جدوجہد کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ محبت وقت اور عمر کے زوال کو شکست دیتی ہے اور فن کے ذریعے امر رہتی ہے۔

جان ڈن (John Donne) فلسفیانہ اور روحانی عشق

انگریزی "Metaphysical" شاعر جان ڈن نے محبت کو ایک گہری فلسفیانہ جہت عطا کی۔ اس کے اشعار میں جسمانی اور روحانی محبت کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ وہ کبھی محبوب کو کائنات کا مرکز قرار دیتا ہے اور کبھی خدا کی محبت کو انسانی دل کی اصل منزل کہتا ہے۔ جان ڈن کے نزدیک محبت ایک ایسا رشتہ ہے جو وقت، جگہ اور فاصلے کی قید سے ماورا ہے۔

لارڈ بائرن (Lord Byron) پرجوش اور المیہ عشق

رومانوی تحریک کے اس عظیم شاعر نے محبت کو اپنی انفرادیت اور بغاوت کے ساتھ پیش کیا۔ اس کے ہاں محبت ایک شعلہ ہے جو جلا بھی دیتا ہے اور روشنی بھی عطا کرتا ہے۔ لارڈ بائرن کی شاعری میں عشق ایک بے قراری، ایک نا آسودہ خواہش اور المیے کی کیفیت میں ڈھل کر سامنے آتا ہے۔

پرسی بیشے شیلے (Percy Bysshe Shelley) محبت اور آزادی

شیلے نے محبت کو انسان کی روحانی آزادی اور بلندی کے ساتھ جوڑا۔ اس کے نزدیک عشق وہ قوت ہے جو انسان کو ظلم، جبر اور تاریکی سے نجات دلا کر روشنی اور آزادی کی طرف لے جاتا ہے۔ شیلے کے اشعار میں محبت انقلاب کا ایک استعارہ بھی ہے۔

جان کیٹس (John Keats) محبت اور حسن کی فنا

کیٹس کی شاعری میں محبت اور حسن ہمیشہ فنا اور وقت کے سایے میں نظر آتے ہیں۔ اس کے مشہور سونٹ Bright Star میں وہ محبوب کے لیے ہمیشہ قائم رہنے کی دعا کرتا ہے۔ کیٹس کے ہاں محبت اور حسن ایک حسین مگر ناپائیدار خواب کی طرح ہیں جو لمحہ بھر کے لیے دل کو مسحور کرتے ہیں مگر وقت کے ہاتھوں بکھر جاتے ہیں۔

گوئٹے (Goethe) المیہ عشق

جرمن شاعر اور ناول نگار گوئٹے کا ناول "The Sorrows of Young Werther" یورپ کے ادب میں محبت کی سب سے مشہور کہانیوں میں سے ہے۔ یہ ایک ایسے عاشق کی کہانی ہے جو محبت میں ناکامی کے بعد خودکشی کر لیتا ہے۔ اس ناول نے پورے یورپ میں ایک تحریک پیدا کی جسے W

CamScanner

Fever کہا گیا۔ گوئٹے کے ہاں محبت انسان کے وجود کی سب سے بڑی لذت بھی ہے اور سب سے بڑی اذیت بھی۔

لیو ٹالسٹائی (Leo Tolstoy) سماجی اور نفسیاتی عشق

روسی ادیب ٹالسٹائی کے ناول "Anna Karenina" میں محبت کو سماجی حدود اور اخلاقی قدروں کے تناظر میں پیش کیا گیا ہے۔ اس ناول میں محبت ایک حسین مگر تباہ کن قوت بن کر سامنے آتی ہے جو انسان کو سماج سے ٹکرا دیتی ہے۔ ٹالسٹائی کے ہاں محبت انسان کی نجات بھی ہے اور اس کی بربادی بھی۔

فیودور دوستوئیفسکی (Fyodor Dostoevsky) محبت اور روح کی کشمکش

دوستوئیفسکی نے محبت کو انسان کی نفسیاتی گہرائیوں اور اخلاقی بحرانوں کے ساتھ پیش کیا۔ اس کے کرداروں میں محبت کبھی خدا کی طرف لے جاتی ہے تو کبھی گناہ اور بربادی کی طرف۔ The Brothers Karamazov اور Crime and Punishment میں یہ بات نمایاں ہے کہ محبت انسان کو روحانی بلندی بھی عطا کر سکتی ہے اور اخلاقی زوال کی طرف بھی دھکیل سکتی ہے۔

مارسل پروست (Marcel Proust) محبت اور یادداشت

فرانسیسی ادیب پروست کے عظیم ناول "In Search of Lost Time" میں محبت کا تعلق یادداشت اور وقت کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ اس کے نزدیک محبت ہمیشہ غیر یقینی اور حسرت سے بھری ہوتی ہے۔ پروست نے دکھایا کہ محبت دراصل یادوں کا جادو ہے جو انسان کو ماضی میں قید کر لیتا ہے۔

یورپی ادب میں محبت کبھی خدا تک رسائی کا راستہ بنی، کبھی ایک المیہ داستان، کبھی انقلاب کی قوت اور کبھی یادداشت کا جادو۔ دانتے سے لے کر پروست تک، ہر شاعر اور مصنف نے محبت کو اپنے زمانے اور اپنے مزاج کے مطابق پیش کیا، مگر سب کے ہاں یہ ایک ابدی اور لازوال حقیقت کے طور پر موجود ہے۔

یورپی ادب کی سب سے بڑی طاقت یہی ہے کہ اس نے محبت کو صرف ایک ذاتی تجربہ نہیں بلکہ ایک کائناتی، روحانی اور تہذیبی سچائی کے طور پر پیش کیا۔

یورپی ادب کی تاریخ کو اگر کھولا جائے تو اس کے اوراق پر سب سے نمایاں تحریر محبت ہی کی ہے۔ کبھی یہ محبت روحانی سفر کی علامت بنتی ہے، کبھی المیے کی صورت اختیار کرتی ہے، اور کبھی وقت اور یادداشت کے فلسفے سے جڑ جاتی ہے۔ ہر دور کے شاعر اور ادیب نے محبت کو اپنی آنکھ سے دیکھا اور اپنی روح کے رنگ میں ڈھالا، مگر سب کے ہاں یہ ایک ایسی قوت کے طور پر سامنے آئی جو انسان کو کائنات کے قریب اور اپنی حقیقت سے آشنا کرتی ہے۔

اطالوی شاعر دانتے الگیری نے اپنی شہرہ آفاق تخلیق The Divine Comedy میں بیاتریس کی محبت کو خدا تک رسائی کا وسیلہ بنایا۔ وہ کہتے ہیں:

The love that moves the sun and the other stars

(وہ محبت جو سورج اور ستاروں کو گردش دیتی ہے۔)

یہاں محبت کو کائنات کی تخلیقی اور محرک قوت کے طور پر پیش کیا گیا ہے، جو انسان کو مادی دنیا سے اٹھا کر آسمانی سفر پر لے جاتی ہے۔

اسی روایت کو پیترآرک نے اپنے "سونٹس ٹو لارا" میں اور زیادہ لطافت دی۔ وہ کہتے ہیں:

Love discovered me all naked, and opened my heart in his reign".

(محبت نے مجھے اکیلے پالیا اور میرے دل پر اپنی حکمرانی قائم کر دی۔)

پیترآرک کے ہاں عشق دل کا ایسا سلطان ہے جو انسان کو اپنی غلامی میں لے لیتا ہے، اور یہ غلامی ہی اصل آزادی ہے۔

انگریزی ادب کے سب سے بڑے ڈرامہ نگار ولیم شیکسپیئر کے ہاں محبت ایک زندہ اور لازوال حقیقت ہے۔ Romeo and Juliet میں جولیٹ کہتی ہے:

My bounty is as boundless as the sea,
My love as deep the more I give to thee,
The more I have, for both are infinite".

(میری سخاوت سمندر کی طرح بے کنار ہے، میرا عشق اتنا ہی گہرا؛ جتنا میں تمہیں دیتا ہوں، اتنا ہی میرے پاس بڑھتا ہے، کیونکہ دونوں لامحدود ہیں۔)

یہاں محبت کو لاانتہا اور لافانی کے طور پر دکھایا گیا ہے، جو بانٹنے سے اور بڑھتی ہے۔

جان ڈن، جو "Metaphysical Poets" کے رہنما سمجھے جاتے ہیں، عشق کو فلسفیانہ و روحانی رنگ دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

If ever any beauty I did see,

Which I desired, and got, twas but a dream of thee".

(اگر میں نے کبھی کوئی حسن دیکھا اور چاہا، تو وہ بس تمہارا خواب تھا۔)

ڈن کے نزدیک اصل حقیقت محبوب ہے، باقی سب حسن اس کا عکس ہے۔

رومانوی تحریک میں لارڈ بائرن نے محبت کو ایک شعلہ قرار دیا۔ وہ لکھتے ہیں:

Love will find a way through paths where wolves would fear to prey".

(محبت وہاں سے بھی راستہ نکال لیتی ہے جہاں بھیڑیے بھی شکار سے ڈرتے ہیں۔)

یہ عشق کی جرات اور بے خوفی کا بیان ہے، جو خطرات سے نہیں ڈرتا۔

پرسی بیشے شیلے نے محبت کو کائنات کے باہمی ربط کی علامت کہا۔ اس کی نظم Love's Philosophy میں وہ کہتے ہیں:

Nothing in the world is single
All things by a law divine
In one another's being mingle
Why not I with thine

(دنیا میں کچھ بھی تنہا نہیں، ہر شے ایک دوسرے میں گھل مل جاتی ہے؛ تو میں کیوں نہ تجھ میں گھل جاؤں؟)

یہاں عشق کو فطرت کا اصول اور وحدت کا قانون بنایا گیا ہے۔

جان کیٹس کے ہاں محبت اور حسن ہمیشہ فنا کی سرحد پر دکھائی دیتے ہیں۔ Bright Star میں وہ دعا کرتا ہے:

Bright star, would I were steadfast as thou art.

(اے روشن ستارے! کاش میں بھی تیری طرح ہمیشہ قائم رہتا۔)

کیٹس کے نزدیک محبت ایک خواب ہے جو وقت کے ہاتھوں فنا ہو سکتا ہے، مگر اس کی یاد دل کو امر کر دیتی ہے۔

جرمن شاعر گوئٹے کے ناول The Sorrows of Young Werther نے یورپ بھر میں محبت کے موضوع کو ہلا دیا۔ وہ لکھتے ہیں:

I am proud of my heart alone, it is the sole source of everything, all our strength, all our happiness".

(میں صرف اپنے دل پر فخر کرتا ہوں، کیونکہ یہی سب کچھ ہے: ہماری طاقت اور ہماری خوشی کا اصل سرچشمہ۔)

گوئٹے کے ہاں دل اور اس کی محبت انسانی وجود کا مرکز ہے۔

روسی ناول نگار لیو ٹالسٹائی کے ہاں محبت فہم اور شعور کی بنیاد ہے۔ Anna Karenina میں وہ لکھتے ہیں:

All, everything that I understand, I understand only because I love".

(جو کچھ بھی میں سمجھتا ہوں، صرف اسی لیے سمجھتا ہوں کہ میں محبت کرتا ہوں۔)

یہاں محبت کو عقل اور علم پر فوقیت دی گئی ہے۔

فیودور دوستوئیفسکی محبت کو انسان کی نجات اور جہنم دونوں کا دروازہ مانتے ہیں۔ The Brothers Karamazov میں لکھتے ہیں:

What is hell I maintain that it is the suffering of being unable to love".

(جہنم کیا ہے؟ میرا کہنا ہے کہ یہ وہ اذیت ہے جب انسان محبت نہ کر سکے۔)

یہاں محبت کو انسان کی اصل نجات اور اس کی کمی کو سب سے بڑی اذیت قرار دیا گیا ہے۔

آخر میں، فرانسیسی ادیب مارسل پروست نے محبت کو وقت اور یادداشت کے ساتھ جوڑ دیا۔ In Search of Lost Time میں وہ کہتے ہیں:

Love is space and time measured by the heart".

(محبت وقت اور مکان ہے جو دل کی پیمائش سے ناپا جاتا ہے۔)

یہاں عشق کو یادوں کی گہرائی اور دل کی کیفیتوں کے ساتھ باندھا گیا ہے۔

یوں دانتے سے پروست تک، پیٹرآرک سے دوستوئیفسکی تک، یورپی ادب کے ہر بڑے نام نے محبت کو مختلف زاویوں سے دیکھا۔ کبھی یہ کائنات کی محرک قوت بنی، کبھی لامحدود قربانی، کبھی فنا کے سائے میں حسن، کبھی دل کا فخر، اور کبھی انسان کی سب سے بڑی نجات۔ لیکن ایک بات سب میں مشترک رہی۔ محبت وہ ازلی اور آفاقی داستان ہے جس کے بغیر انسان کا وجود ادھورا ہے۔ یہی داستان ہے جو یورپی ادب کی روح ہے اور جس نے اس کے سب سے روشن اور لازوال شہ پارے تخلیق کیے۔

CS CamScanner

شیکسپیئر سونٹ

Shall I compare thee to a summer's day
Thou art more lovely and more temperate"......

(کیا میں تمہارا موازنہ گرمیوں کے دن سے کروں؟
تم اس سے کہیں زیادہ حسین اور متوازن ہو۔)

یہ سونٹ محبوب کو فطرت کی خوبصورتی سے بلند تر دکھاتا ہے اور محبت کو ابدی بنا دیتا ہے۔

جان ڈن The Good-Morrow

For love, all love of other sights controls,
And makes one little room an everywhere".

(محبت وہ قوت ہے جو باقی سب نظاروں پر غالب آجاتی ہے،
اور ایک چھوٹے کمرے کو پوری کائنات میں بدل دیتی ہے۔)

ڈن کے ہاں عشق ایک محدود لمحے کو لامحدود وسعتوں میں بدل دیتا ہے۔

لارڈ بائرن She Walks in Beauty

She walks in beauty, like the night
Of cloudless climes and starry skies......

(وہ حسن میں چلتی ہے، جیسے ستاروں سے بھری رات
صاف آسمان اور بادلوں سے عاری افق کی طرح)

یہاں محبوبہ کو رات کے آسمان کی شفافیت اور خاموش عظمت کے ساتھ جوڑا گیا ہے۔

پرسی بیشے شیلے Love's Philosophy

The fountains mingle with the river,
And the rivers with the ocean......

(چشمے دریا میں ملتے ہیں،
اور دریا سمندر میں جا گرتے ہیں......)

یہاں فطرت کی ہر شے کا ملاپ محبت کی علامت ہے، اور انسان کو بھی اسی اصول پر عمل کرنا چاہیے۔

جان کیٹس Bright Star

Bright star, would I were steadfast as thou art"......

(اے روشن ستارے! کاش میں بھی تیری طرح ہمیشہ قائم رہتا۔)

کیٹس کے ہاں محبوب کے وصال کو ابدیت کی تمنا سے جوڑا گیا ہے۔

ایلزبتھ بیریٹ براؤننگ How Do I Love Thee (Sonnet 43)

How do I love thee Let me count the ways.
I love thee to the depth and breadth and height
My soul can reach"......

(میں تم سے کیسے محبت کرتی ہوں؟ آؤ میں راستے گنواؤں۔
میں تم سے اتنی محبت کرتی ہوں جتنی میری روح کی گہرائی، چوڑائی اور بلندی چھو سکتی ہے۔)

یہ نظم زومانوی محبت کی سب سے زیادہ مقبول اور خوبصورت اعترافات میں شمار ہوتی ہے۔

یہ نظمیں یورپی ادب میں محبت کے مختلف رنگ دکھاتی ہیں: کہیں محبوب کو کائنات کا مرکز بنایا گیا، کہیں فطرت کی عکاسی کے ساتھ جوڑا گیا، اور کہیں دل کی ابدی تمنا کے طور پر پیش کیا گیا۔ ان سب نے مل کر محبت کو ادب کا سب سے روشن موضوع بنا دیا۔

محبت کی قوت ایسی ہے کہ یہ انسان کو وہ ہمت عطا کرتی ہے جس کا شاید اسے خود بھی اندازہ نہیں ہوتا۔ یہی قوت انسان کو معمولی سے غیر معمولی بنا دیتی ہے۔ میر تقی میر کے ہاں عشق ایک ایسی کیفیت ہے جو دل کو جلا کر رکھ دیتی ہے مگر ساتھ ہی زندگی کو ایک نیا معنی بھی دیتی ہے۔ غالب نے عشق کو زندگی کا محور قرار دیا اور کہا کہ محبت کے بغیر وجود محض ایک خالی ظرف ہے۔ صوفی شعراء نے اس قوت کو الوہی رنگ دیا اور اسے خدا تک پہنچنے کا ذریعہ سمجھا۔ مولانا رومی نے عشق کو ایک ایسی سیڑھی کہا جس کے ذریعے انسان اپنی اصل حقیقت تک رسائی حاصل کرتا ہے۔

لیکن محبت محض مسرت اور قوت کا دوسرا نام نہیں، اس کے ساتھ قربانی کا تصور بھی جڑا ہوا ہے۔ عشق کے سفر میں کبھی آسانیاں نہیں ملتیں، یہ راستہ ہمیشہ کانٹوں سے بھرا ہوا رہا ہے۔ ہیر رانجھا کی کہانی اس بات کی مثال ہے کہ کس طرح محبت قربانی کا تقاضا کرتی ہے اور اسی قربانی سے امر ہوتی ہے۔ سسی پنوں اور لیلیٰ مجنوں کے کردار آج بھی زندہ ہیں کیونکہ انہوں نے اپنے عشق کے لیے سب کچھ قربان کر دیا۔ مغربی ادب میں رومیو اور جولیٹ کی داستان اسی حقیقت کو اجاگر کرتی ہے کہ محبت اپنی تکمیل قربانی کے بغیر نہیں کر پاتی۔ قربانی عشق کو وہ عظمت عطا کرتی ہے جو اسے ازلی داستان بنا دیتی ہے۔

ادب میں محبت کا اظہار ہمیشہ مرکزی رہا ہے۔ چاہے وہ کلاسیکی شاعری ہو یا جدید افسانہ نگاری، محبت نے ہر جگہ اپنی چھاپ چھوڑی ہے۔ اردو غزل کی پوری روایت محبت کے گرد گھومتی ہے۔ میر کے ہاں محبت ایک مسلسل درد ہے، غالب کے ہاں ایک فلسفہ ہے، اور فیض کے ہاں یہ محبت ذاتی محبوب سے نکل کر اجتماعی محبوب یعنی انسانیت تک جا پہنچتی ہے۔ وارث شاہ کی ہیر صرف ایک عاشق کی کہانی نہیں بلکہ پورے معاشرے کے دکھ درد کی عکاسی ہے۔ اسی طرح جدید

ادب میں قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں محبت وقت، تاریخ اور تہذیب کے پس منظر میں ابھرتی ہے۔ بانو قدسیہ کے ''راجہ گدھ'' میں عشق صرف رومانوی جذبہ نہیں بلکہ ایک اخلاقی وروحانی بحران کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ان سب مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ محبت ادب میں ہمیشہ اپنی مختلف صورتوں میں جلوہ گر رہی ہے۔

محبت کی داستان کبھی پرانی نہیں ہوتی۔ ہر دور میں یہ نئے روپ میں سامنے آتی ہے، کبھی ایک گیت کی صورت، کبھی ایک غزل کے مصرعے میں، کبھی ایک ناول کی طویل کہانی میں اور کبھی ایک صوفی کے کلام میں۔ محبت دلوں کو جوڑتی ہے، انسان کو انسانیت سے قریب کرتی ہے اور زندگی کو ایک ایسا رنگ دیتی ہے جس کے بغیر وجود بے معنی محسوس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محبت کو ہمیشہ ازلی داستان کہا گیا ہے۔ یہ داستان ختم نہیں ہوتی کیونکہ محبت محض ایک جذبہ نہیں بلکہ ایک ابدی سچائی ہے۔ یہ انسان کے دل کی دھڑکن ہے، کائنات کی زبان ہے، اور وقت کے ہر دور میں اپنی روشنی بکھیرتی چلی جاتی ہے۔

محبت وہ چراغ ہے جو ازل کی شام سے جل رہا ہے اور ابد کی صبح تک جلتا رہے گا۔ یہ وہ لطیف جذبہ ہے جو دل کے نہاں خانوں میں پھوٹ کر کائنات کو رنگین کر دیتا ہے۔ محبت انسان کے وجود کو معنویت بخشتی ہے اور زندگی کو ایک ایسا سحر عطا کرتی ہے جس کے بغیر یہ کائنات ایک بے کیف صحرا محسوس ہوتی ہے۔ ازل سے آج تک انسان نے محبت کو اپنی کہانیوں کا محور بنایا، اپنے گیتوں کا موضوع بنایا، اور اپنے خوابوں کا سرورق بنایا۔

محبت کی قوت وہ ہے جو مٹی کے انسان کو ستاروں کی رفعت تک لے جاتی ہے۔ میر نے کہا تھا کہ دل جلنے سے انسان زندہ رہتا ہے، اور غالب نے عشق کو اپنی ہستی کا جواز قرار دیا۔ یہی عشق کبھی وصل کی خوشبو بن کر دل کو معطر کرتا ہے، تو کبھی ہجر کی چبھن بن کر روح کو گداز میں ڈھالتا ہے۔ مگر دونوں صورتوں میں یہ قوت انسان کو جینے کا ہنر سکھاتی ہے۔ صوفیاء کے نزدیک محبت خدا تک رسائی کا وسیلہ ہے۔ رومی نے کہا، ''عشق وہ پر ہے جس سے انسان اپنی اصل پرواز پاتا ہے۔'' بلھے شاہ نے بھی اسی عشق کو کائنات کا راز قرار دیا۔

لیکن یہ داستان محض راحت اور مسرت تک محدود نہیں۔ محبت ہمیشہ قربانی کے بغیر ادھوری رہی ہے۔ رانجھے کا ہیر کے لیے سب کچھ چھوڑ دینا، سسی کا ریگستان میں خاک چھاننا، لیلیٰ مجنوں کا سماج سے بغاوت کرنا، یا رومیو اور جولیٹ کا موت کو گلے لگانا یہ سب قربانی کی تصویریں ہیں۔ محبت کی اصل شان تب ظاہر ہوتی ہے جب عاشق اپنی انا، اپنی خواہش اور اپنی زندگی کو قربان کر دیتا ہے۔ یہی قربانی عشق کو لازوال بنا دیتی ہے اور اسی سے محبت ایک ازلی داستان کی صورت اختیار کرتی ہے۔

ادب میں محبت کا اظہار ہمیشہ دل کی دھڑکن کی طرح جاری رہا ہے۔ کلاسیکی غزل کی پوری روایت اس جذبے کی ترجمان ہے۔ میر کی غزلوں میں عشق ایک دائمی دکھ ہے، غالب کے اشعار میں یہ فلسفے کی صورت میں ڈھلتا ہے، اور فیض کے ہاں یہ محبت ذاتی محبوب سے نکل کر انسانیت کی اجتماعی محبت بن جاتی ہے۔ وارث شاہ کی ''ہیر'' محض ایک عشق کی کہانی نہیں بلکہ پورے پنجاب کی دھرتی کا نوحہ ہے۔ جدید ادب میں قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں محبت تاریخ کے دھارے میں بہتی ہے اور بانو قدسیہ کے ''راجہ گدھ'' میں عشق انسانی روح کے امتحان کی صورت اختیار کرتا ہے۔ یہ سب مثالیں اس بات کی شاہد ہیں کہ محبت ادب کا سب سے روشن اور لازوال موضوع ہے۔

محبت کی داستان کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ یہ ہر دور میں نئے رنگ، نئی خوشبو اور نئی صورت کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔ کبھی ایک صوفی کے کلام میں خدا کی جستجو بن کر، کبھی ایک شاعر کے مصرعے میں محبوب کی صورت اختیار کر کے، اور کبھی ایک ناول میں انسانی دکھ درد کا روپ دھار کر۔ محبت انسان کو انسانیت سے جوڑتی ہے، دلوں کے درمیان پُل بناتی ہے، اور وجود کو ایسی وسعت دیتی ہے جس میں کائنات سمٹ آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محبت کو ہمیشہ ایک ازلی داستان کہا گیا ہے۔ ایک ایسی داستان جو وقت کی گردش سے ماورا ہے، جو فنا کے بیابان میں بھی باقی رہتی ہے، اور جو انسان کے دل کی دھڑکن کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔

بہ یاد: سید قاسم محمود
ماہنامہ بک ڈائجسٹ لاہور پاکستان
Book Digest
ISSN 2079-4584
مدیر اعلیٰ: مظہر سلیم مجوکہ
مدیر: اظہر سلیم مجوکہ
صوبہ پنجاب کے تمام کالجوں اور پبلک لائبریریوں کیلئے منظور شدہ
رسالے کے حصول کے لئے
سالانہ زرِتعاون مبلغ -/2500 روپے
0321-4377794
paisa 0333-4377794
Mazhar Saleem Majoka
برائے خط وکتابت / ترسیل زر / رابطہ
کتاب ورثہ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور
042-37322996
0333-4377794
bookdigest@hotmail.com,kitabvirsa@gmail.com

بھگت سنگھ شہید اور تحریک آزادی

ثوبیہ شاہ/ فیصل آباد

بھگت سنگھ ہماری تاریخ کا ایک ایسا نام ہے۔ جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ بھگت سنگھ ایک مشہور ہندوستانی انقلابی اور سوشلسٹ تھے جنہوں نے برطانوی راج کے خلاف جدوجہد میں اہم کردار ادا کیا۔ بھگت سنگھ پنجاب کے شہر لائل پور (موجودہ فیصل آباد) کے گاؤں "بنگے" 105 میں 28 ستمبر 1907 کو سردار کشن سنگھ کے گھر پیدا ہوئے۔ آپ کے دادا کا نام ارجن سنگھ تھا۔ بھگت سنگھ نے اپنی زندگی وطن کی آزادی کے لیے وقف کر دی۔ وہ ہندوستان کی تحریک آزادی میں ایک اہم شخصیت ، اور نوجوانوں میں بہت مقبول تھے بھگت سنگھ ایک نوجوان انقلابی تھے۔ ان کے خاندان کا سیاست اور تحریک آزادی سے گہرا تعلق تھا۔ بچپن سے ہی ان میں ملک کے لیے کچھ کر گزرنے کا جذبہ تھا۔ وہ شروع میں گاندھی کے نظریات سے متاثر تھے لیکن بعد میں انہوں نے مسلح جدوجہد کا راستہ اختیار کیا۔ ان گاوں میں ایک سکول تھا۔ جہاں بھگت سنگھ نے تعلیم حاصل کی۔ بھگت سنگھ کے بھائی سردار راجیت سنگھ کے انتقال کے بعد سردار کشن سنگھ نواں کوٹ (جو لاہور کے قریب واقع ہے) چلے گئے۔ یہاں ان کی کچھ زمینداری بھی تھی۔ لاہور میں بھگت سنگھ کی تعلیم جاری رکھنے کا سوال اٹھا۔ عام رواج کے مطابق ایک سکھ لڑکا ہمیشہ خالصہ ہائی سکول میں داخل ہوا کرتا تھا۔ لیکن چونکہ اس اسکول کے منتظموں کا شمار سلطنت انگلش کے خیر خواہوں میں تھا اس لیے سردار صاحب نے بھگت سنگھ کی ذہنیت کو تبدیل ہونے سے بچانے کے لیے انھیں بجائے خالصہ اسکول کے ڈی۔ اے۔ وی اسکول میں داخل کیا۔ بھگت سنگھ اس اسکول سے میٹرک پاس کر کے نیشنل کالج چلا گیا۔ کانگرس کا اجلاس کانپور میں قرار پایا تو بھگت سنگھ نویں درجہ میں پڑھتے تھے لیکن ان کا رجحان ان کو کھینچ کر وہاں لے گیا کالج میں بھگت سنگھ کا میل جول ہم خیال نوجوانوں سے سکھ دیو اور جنے گوپال سے بڑھا۔ بھگت سنگھ ابھی صرف چودہ ہی برس کے تھے کہ ان کے دل نے انہیں مادر وطن کی خدمت کرنے پر مجبور کیا۔

1925ء سے 1926ء کے درمیان بھگت سنگھ نے اپنے دماغ میں اتنا کثیر علمی اور تاریخی ذخیرہ مہیا کر لیا تھا۔ جس نے ان کی باقی ماندہ زندگی میں انہیں ٹھیک راستہ دکھایا۔ وہ لالہ لاجپت رائے کے قائم کردہ نیشنل کالج میں داخل ہوئے اور تواریخ سیاسیات اور اقتصادیات کے مطالعہ میں سر لگ گئے۔ یہاں ان کے دو وفادار ساتھی سکھ دیو اور بھگوتی چرن تھے اور ان تینوں نے دو ایک مزید لوگوں کو ساتھ لے کر ایک سٹڈی سرکل روس کے انقلابی نمونے پر قائم کیا۔ دی سرونٹس آف دی پیوپل سوسائٹی نے فیاضی کے ساتھ دوار کا داس لائبریری سے وہ سب کتابیں دلوا دیں جو ان پرجوش طالب علموں نے چاہیں۔ اس بارے میں نیشنل کالج کے پروفیسر چھبلیداس اور لائبریرین مسٹر راجہ رام جیسے مشہور اشخاص کی شہادت موجود ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ بھگت سنگھ کس تندہی اور شوق کے ساتھ ان کتابوں کا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ نیشنل کالج میں سردار بھگت سنگھ کی رہنمائی سے کتابوں کا ایک حیرت انگیز ذخیرہ جمع ہو گیا جو کسی دوسرے کتب خانے میں نہیں تھا۔

سترہ سال کی عمر تک وہ دانشورانہ بلوغت کو پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے پنجاب میں زبان کے مسئلے پر ہندی میں ایک مضمون لکھا جس پر انہیں انعام ملا۔ انہوں نے 1924 اور 1925 میں 'وشو پریم' (عالمگیر محبت) اور 'یوداک' کے نام سے علی الترتیب دو کتابیں لکھیں جو مٹوالا میں شائع ہوئیں۔ یہ دونوں کتابیں انہوں نے اپنے قلمی نام سے لکھی تھیں۔ انہوں نے ایک مضمون 'ہولی کے دن خون کے چھینٹے' کے عنوان سے ان چھ ببرا کالی انقلابیوں پر بھی لکھا تھا جن کو 1926 میں سولی پر چڑھا دیا گیا۔ بھگت سنگھ نے یہ مضمون "ایک پنجابی نوجوان" کے نام سے لکھا۔ مارکس ازم کے بارے میں ان کی وسیع معلومات اور شعوری پختگی کا سبب یہ تھا کہ دوارکہ داس لائبریری میں مارکس ازم سے متعلق کافی لٹریچر پہنچتا رہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ 1924 کے لگ بھگ، بھگت سنگھ اس کتب خانے کے ایک بہت ہی جوشیلے اور پرشوق قاری بن گئے تھے۔ ۔ جب ان کا رابطہ جریدہ "کرتی" گروپ سے بڑھا جس کا تعلق پنجاب کے گھدرائٹ انقلابیوں سے تھا۔ (غدرائٹ انقلابیوں ("Ghadarite revolutionaries") کی اصطلاح ان لوگوں کے لیے استعمال ہوتی ہے جو 1913 میں قائم ہونے والی غدر پارٹی کے ارکان تھے اور ہندوستان کو برطانوی راج سے آزاد کرانے کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔) تو وہ تقریباً ایک کمیٹڈ مارکسسٹ بن چکے تھے۔ انہوں نے بڑی باقاعدگی کے ساتھ "کرتی" میں مختلف موضوعات مثلاً فرقہ پرستی اور اس کا حل' اچھوت پن کے مسائل' مذہب اور ہماری جدوجہد آزادی وغیرہ جیسے مسائل پر مضامین تحریر کیے۔ اگرچہ وہ غدرائٹ انقلابیوں سے کچھ اختلافات بھی رکھتے تھے مگر اس کا تعلق انقلابی پارٹی کے پروگرام کے حوالے سے تھا۔ بھگت سنگھ اور اس کے دیگر انقلابی ساتھی پورے ملک کو خواب غفلت سے بیدار کرنے پر آمادہ ہو چکے تھے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ نوجوان نسل جرات مندی کے ساتھ قومی انقلابی کارکردگی کا مظاہرہ کرے اور نوآبادیاتی نظام کے خلاف چلنے والی تحریک کو آگے بڑھائے۔

1924 میں بھگت سنگھ کانپور سازش کیس کے تحت جیل سے رہا ہو کر لاہور آئے تھے۔ اس زمانے

میں بھگت سنگھ کیمونسٹ پارٹی میں شمولیت کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے کیونکہ اس وقت وہ اور ان کے دوسرے قریبی ساتھی خود اپنی تنظیم این-بی-ایس کو ایک انقلابی جماعت بنانے میں کوشاں تھے۔ بھگت سنگھ پر یہ حقیقت واضح تھی کہ ہندوستان سوشلسٹ ریپبلکن ایسوسی ایشن (ایچ۔ایس۔آر۔اے) کے جھنڈے تلے کسانوں، طالب علموں اور معاشرے کے دیگر انقلاب پسندوں کو جمع کرنا ضروری ہے۔

دہلی اسمبلی بم کیس کے سلسلہ میں اپنا یادگار تاریخی بیان دیتے ہوئے بھگت سنگھ نے اعلان کیا تھا" ہم ادب کے ساتھ تاریخ کے سنجیدہ طالب علم ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں" نوجوانوں پر اپنے اثرات مرتب کرنے والے بھگت سنگھ کو لاہور کی پولیس نے مئی 1927 میں گرفتار کرلیا۔ ان کو اکتوبر 1926 میں دسہرہ بم دھماکے میں ملوث ہونے کے الزام میں قید کرلیا گیا۔ اسی زمانے میں بھگت سنگھ پنجاب میں ایک بڑی عوامی جدوجہد کا منصوبہ بنا رہے تھے مگر اس سے پہلے کہ یہ عظیم منصوبہ پایہ تکمیل کو پہنچتا ہندوستان میں سائمن کمیشن آدھمکا۔ 6 جون 1929 میں دہلی بم دھماکہ کیس کے تحت بھگت سنگھ اور بی۔کے۔دت کے بیانات کو دونوں کی پیشی کے وقت سیشن کورٹ میں پڑھ کر سنایا گیا تھا۔ یہ بیانات تنظیم کی پالیسی کی دستاویز کی حیثیت رکھتے تھے۔ جن میں انقلابی کے اغراض و مقاصد کو بہت صراحت کے ساتھ ساتھ بیان کردیا گیا تھا۔

بھگت اور ان کے ساتھیوں نے سانڈرس قتل مقدمے کا بائیکاٹ کردیا۔ ٹریبونل نے جس طرح بھگت سنگھ، راج گرو اور سکھ دیو کو سزائے موت دی۔ اس کا کچا چٹھا اے۔جی۔نورانی نے اپنی کتاب ''بھگت سنگھ کا مقدمہ'' میں کھولا ہے، مقدمے کی کاروائی اور سزاؤں کا اعلان بالکل ایسا ہی تھا جیسے برطانوی آبادکار ہندوستانی انقلابیوں کے قتل کا حکم جاری کریں۔ بھگت سنگھ نے پھانسی سے تین دن پہلے 20 مارچ کو پنجاب کو بجا طور پر لکھا تھا کہ ان کے ساتھ جنگی قیدیوں جیسا سلوک کیا جائے کیونکہ وہ برطانوی سامراج کے خلاف جنگ کر رہے ہیں اس لیے انہیں پھانسی کے بجائے گولی مار کر ہلاک کیا جائے لیکن برطانوی سامراجی حکومت اتنی بزدل ثابت ہوئی کہ پھانسی کے لیے مقررہ وقت صبح چھ سے سات بجے پر قائم نہ رہ سکی۔ تمام بین الاقوامی روایات کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بھگت سنگھ، راج گرو اور سکھ دیو کو 23 مارچ 1931ء شام سات بجے تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔ پھانسی کے وقت آپ کی عمر 24 سال تھی۔

بھگت سنگھ نہایت قابل تعلیم یافتہ نوجوان تھا۔ اور وہ سوشلزم کی کتابوں کے پڑھنے میں خاص طور پر دلچسپی لیتا رہا بھگت سنگھ کی دلیری اور قربانیوں نے اس وقت کی فضا میں جبکہ سیاسیات میں کمزوری پیدا ہوگئی تھی بجلی کا سا کام کیا۔

یہ بھگت سنگھ ہی تھا جس نے انقلاب زندہ باد کے نعرے پہلے پہل عدالتوں میں لگائے۔ جس کی آواز بازگشت آج ہم سب ہندوستان کی ہر گلی کوچوں میں ہر دو سنتے ہیں گو کہ بھگت سنگھ اب ہم میں نہیں ہے لیکن پھر بھی جب ہم انقلاب زندہ باد کا نعرہ سنتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ بھگت سنگھ زندہ باد کا نعرہ بھی ہمارے کانوں میں گونج جاتا ہے۔

بھگت سنگھ کی حویلی کو میوزیم میں تبدیل کردیا گیا ہے۔ اس حویلی کو دیکھنے کے لیے بہت سے لوگ دور دراز سے آتے ہیں۔ خاص طور پر سکھ حضرات کینیڈا اور بھارت سے آتے ہیں۔ تو ہمیں بتاتے ہیں کہ بھگت سنگھ کیا تھے؟ کیونکہ وہ ہم سے زیادہ بہتر جانتے ہیں اور پھر بچے ان کو دیکھتے ہیں۔ ان کے تاثرات بچوں کو بتاتے ہیں، کہ وہ کس سلسلے میں آئے تھے۔ جس سے بچوں میں ایک نیا جزبہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں بھی آزادی کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔ بھگت سنگھ نے ایک تحریک چلائی تھی جوان کی فکر تھی۔ اس فکر کو آگے لے کر چلیں تو ہم یکجا ہوسکتے ہیں۔

بھگت سنگھ کی حویلی کے (موجودہ) مالک ثاقب ورک کہتے ہیں۔

''مذہب اور فرقے الگ الگ ہوسکتے ہیں مگر انسان تو ایک جیسے ہیں۔ بھگت سنگھ نے انسانی نقطہ نظر سے اس تحریک کو چلایا تھا ہمیں اسی چیز کو لے کر بھارت یا کوئی بھی ملک ہو دنیا سے ایک دوسرے سے کشمکش ہے تو وہ دور ہوسکتی ہیں یہ گھر 1947 میں میرے دادا ابوفضل قادر ورک کو الاٹ ہوا تھا۔ اس دور میں پوری دنیا سے مہمان خاص طور پر سردار حضرات تشریف لاتے تھے۔ دو کمرے 1890ء کے بنے ہوئے ہیں۔ اسی حالت میں موجود ہیں جو بھگت سنگھ کے والدین نے بنائے تھے۔ 2014 میں اس وقت کے ڈپٹی کمشنر اونور الامین مینگل نے اس گھر کی تزئین و آرائش کروائی۔ اس کی چھت خراب ہوگئی تھی، جسے اتار کر دوبارہ کچھ شہتیر اور بالے نئے ڈالے گئے۔ باقی کو رندہ لگا کر دوبارہ قابل استعمال بنا لیا گیا۔

بھگت سنگھ کے مرنے کے بعد ان کی شخصیت پر بہت سارے مصنفوں نے کالم، مضمون، اور کتابیں لکھی ہیں۔

شیو ورما کی مرتب کردہ کتاب
The Slected Writings of Shaheed Bhagat Singh, National Book Centre, New Delhi 1986,

دوسری کتاب بھگت سنگھ، مصنف: دیا کشن گجور، سن اشاعت: 1938، موضوعات: سوانح حیات۔

تیسری کتاب: بھگت سنگھ اور اس کے ساتھی، مصنف: اجے گھوش، سن اشاعت: 1984، موضوعات سوانح حیات اور تحریکات۔

چوتھی کتاب: شہید بھگت سنگھ اور دیگر ڈرامے، مصنف: قاضی مشتاق احمد، سن اشاعت: 2015،

پانچویں کتاب: بھگت سنگھ منتخب تحریریں اور تقریریں، مصنف: ڈی این گپتا، ترجمہ: فیصل اعوان

سچّے جذبوں کا جدت پسند شاعر اور ادیب صادق راہی (ستارہ امتیاز ملٹری)

لیاقت علی منہاس/میاں چنوں

میاں چنوں کی سرزمین قابل فخر اور اس قدر زرخیز ہے کہ اس دھرتی پر کھلنے والے پھولوں نے بجا طور پر مختلف شعبہ ہائے زندگی میں ملکی و بین الاقوامی سطح پر اپنی ذہانت، متانت، قابلیت اور محنت سے مادرِ وطن اور میاں چنوں کا نام روشن کیا ہے جس پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔ اس خوبصورت دھرتی کے فرزند سابق وزیر اعلیٰ پنجاب و قائد حزب اختلاف قومی اسمبلی شہید غلام حیدر وائیں نے اپنی بے پناہ سیاسی بصیرت، بے لوث قیادت، جذبہ حب الوطنی، پرخلوص جذبوں اور دیگر گراں قدر شخصی خوبیوں کے باعث ملکی و عالمی سطح پر انمٹ نقوش چھوڑے اور خوب شہرت پائی اور میاں چنوں کا بول بالا کیا۔ علاوہ ازیں سکاٹ لینڈ کے وزیر اعظم حمزہ یوسف ہوں یا سلطنت برطانیہ کے تخت و تاج کے وارث بادشاہ چارلس سے سماجی خدمات کے اعتراف میں برٹش ایمپائر میڈل حاصل کرنے والے شاعر احسان شاہد چوہدری ہوں یا پھر انٹرنیشنل شہرت یافتہ سماجی شخصیت المصطفیٰ ویلفیئر ٹرسٹ کے چیئرمین عبدالرزاق ساجد ہوں یا پھر اولمپک اتھلیٹ ارشد ندیم ہوں یا دُنیائے طنز و مزاح کے شہنشاہ عظیم فنکار افتخار ٹھاکر ہوں یا عصر نو کی اُبھرتی ہوئی فنکارہ عکاشہ گل اشرف ہوں۔ یہ سبھی میاں چنوں کے درخشاں ستارے ہیں جنہوں نے اُفق عالم پر ایک روشن تاریخ رقم کی۔

میاں چنوں صادق راہی کا ننھیال اور سسرال ہے۔ ان کی والدہ محترمہ میاں چنوں کی دھی رانی ہیں جن کی آغوش میں ترتیب و پرورش پا کر انہوں نے اپنا بچپن ولڑکپن کا زمانہ زیادہ تر اسی زرخیز سرزمین پر کھیلتے کودتے، دوستیاں پالتے اور شرارتوں میں گزارا ہو تو یقیناً اس دھرتی کے خوبصورت اثرات اور خوبیوں کا ان کی شخصیت اور کردار پر اثر انداز ہونا ایک فطری عمل ہے۔ وہ خود کہتے ہیں۔

چنوں جو سارے جگ میں ہی مشہور ہے میاں
ہر شخص کی قدر یہاں مسرور ہے میاں
اپنا بھی راہی واسطہ ہے اس دیار سے
ہم کو بھی شعر گوئی پہ عبور ہے میاں

صادق راہی صاحب نے میٹرک کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کرتے ہی ارض پاک کے سپاہی بننے کے سفر کا آغاز کر دیا۔ ان کو بچپن ہی سے شعر و سخن سے گہرا لگاؤ تھا۔ ان کے دماغ کے نہاں خانوں اور فکری سوچ میں شاعری اور نثر نگاری کا اثاثہ پوشیدہ تھا انہوں نے اوائل عمری میں اپنے ذوق و شوق اور دماغ میں پنہاں فن اور ادب کے جراثیم کو بچوں کے اخبارات ورسائل میں کہانیاں لکھنے سے زمانے پر آشکار کرنا شروع کر دیا ساتھ ہی ہلکے پھلکے انداز میں غزلیں اور نظمیں بھی صفحہ قرطاس پر بکھیر کر اپنے ہم عصر بچوں کو ورطۂ حیرت میں ڈالتے ہوئے اپنی ذہانت و قلمی فنکاری کا سکہ جماتے دنیائے شعر و ادب میں کامیابی اور شہرت کے جھنڈے گاڑنے شروع کر دیے اس دوران انہیں مقابلے کے امتحان میں نمایاں کامیابی پر چار سالہ تعلیم اور عسکری تربیت کے لیے جونیئر کیڈٹ بٹالین پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول کے لیے منتخب کیا گیا۔ عسکری تربیت کامیابی سے طے کرنے پر انہیں افواجِ پاکستان میں بطور سیکنڈ لیفٹیننٹ کمیشن ملا اور 2018ء میں 32 سالہ کلر سروس مکمل کرنے پر بریگیڈیئر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

2018ء میں ان کو بے مثال عسکری خدمات سرانجام دینے پر صدر پاکستان کی جانب سے ستارۂ امتیاز (ملٹری) سے نوازا گیا۔

صادق راہی کی شاعری نثر اور کالم نگاری میں جہاں پیار، محبت و چاہت اور اپنائیت کے خوبصورت رنگ قوس و قزح کی صورت نظر آتے ہیں وہیں دشمن بھارت کے لیے گرج دار للکار بھی سنائی دیتی ہے۔ ان کی کتاب مسافت دل سفر دل کی داستان طباعت کے مراحل میں ہے۔ عسکری خدمات انجام دیتے ہوئے آپ نے قلم سے رابطہ نہ توڑا اس دوران نثر نظم، غزل، نعت برابر لکھتے رہے۔ گویا سخنوری آپ کے انگ انگ اور روح میں رچی بسی ہوئی ہے جس سے ناتا توڑنا ان کے نزدیک زندگی سے ناتا توڑنے کے مترادف ہے۔ ان کے نثر پاروں اور شاعری کے کئی رنگ ہیں۔ ہر رنگ دل ونظر کو ایسے بھاتا ہے جیسے عالم شباب میں کسی حسین نازنین کی پرفریب ادائیں اور مسکان کسی بھی نوجوان کی روح اور دل کو مسحور کرتی ہیں۔ آپ نیشنل ڈیفنس یونیورسٹی اسلام آباد پاکستان سٹاف کالج کوئٹہ اور کمانڈ اینڈ سٹاف کالج قاہرہ (مصر) کے فارغ التحصیل ہیں۔ اپنے 32 سالہ عسکری کیریئر میں انہوں نے کمانڈ سٹاف اور انسٹرکشنل عہدوں پر عسکری خدمات انجام دیں جبکہ پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول میں بطور پلاٹون کمانڈر تعینات رہے۔ انہیں اقوامِ متحدہ کے امن مشن صومالیہ میں سٹاف آفیسر لاجسٹک کی حیثیت سے خدمات انجام دینے کا موقع ملا۔ بریگیڈیئر ریٹائرڈ صادق راہی نے اقوام متحدہ آفس جنیوا کے تحت منعقد ہونے والی 8 انٹرنیشنل کانفرنسز میں پاکستان کی نمائندگی کی اور کلسٹر بموں کو انٹرنیشنل مسلمہ پروٹوکول اور SOPs کے مطابق بحفاظت سٹور کرنے اور اس کی ہینڈلنگ میں پاکستان کے نیشنل سٹینڈرڈ کو اقوام عالم کے سامنے Present کر کے داد تحسین حاصل کی اور ملک کی

عزت و وقار میں اضافہ کرنے کا بھی اعزاز حاصل کیا۔ وہ نیشنل یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی اسلام آباد میں گیسٹ سپیکر کے طور پر یو این Internal Logistics پر لیکچر دیتے ہیں۔ آپ کالج میگزین، نخلستان اور پاکستان ملٹری اکیڈمی کے میگزین "قیادت" کے مدیر بھی رہ چکے ہیں۔

ریٹائرمنٹ کے بعد آپ بنک آف پنجاب میں ایڈمنسٹریشن اور سیکورٹی کے کنٹری ہیڈ بھی رہ چکے ہیں۔ اپنے دو سالہ قیام کے دوران انہوں نے ATMs کو محفوظ بنانے کے لیے سنٹرل کنٹرول اور مانیٹرنگ سسٹم کو پلان اور کامیابی سے لانچ کیا جس سے غیر متعلقہ افراد کی کارروائیوں اور چوریوں پر بروقت کنٹرول ممکن ہو سکا۔ Covid19 کورونا میں عوام کی سہولت کے لیے بنک آف پنجاب نے لاہور اور اسلام آباد میں ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ کے تعاون سے پاکستان میں پہلی بار ڈرائیو تھرو ویکسینیشن سنٹرز کا انعقاد کیا۔ ان دونوں سنٹرز کو عوام کی جانب سے بے حد پذیرائی ملی۔ جس کو تین ماہ تک کامیابی سے چلانے کا سہرا بریگیڈیئر (ر) صادق راہی کو جاتا ہے۔

بنک آف پنجاب کے بعد انہوں نے پاور سیکٹر میں پاکستان کی سب سے بڑی کمپنی "نیشنل گرڈ کمپنی" Wapda، NTDC میں بطور چیف سیکورٹی آفیسر خدمات انجام دیں اور ملک بھر میں موجود قومی اثاثوں (گرڈ اسٹیشنز اور ٹرانسمیشن لائن) کو محفوظ بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ سندھ پولیس اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کے تعاون سے سندھ میں تخریبی کارروائیوں اور چوری کے بڑھتے ہوئے واقعات کو کامیابی سے کنٹرول کیا۔ ایسے اقدامات متعارف کروائے جس سے بجلی چوری اور ملکی سرمایہ کو ضائع ہونے سے بچانے میں مدد ملی۔

آپ اردو کے بہترین جدت پسند شاعر ہونے کے علاوہ پنجابی شاعری میں بھی طبع آزمائی کرتے رہتے ہیں۔ ان کے اردو اور پنجابی کے کچھ اشعار بطور نمونہ پیش ہیں:

نعتیہ اشعار:

یہ ذرّے یہ تارے محمدؐ کے ہیں
دو عالم میں جلوے محمدؐ کے ہیں
مری ساری حمدیں خداوند کی ہیں
رسالت ہو راہی کہ پیغمبری
بڑے سارے عہدے محمدؐ کے ہیں

غزلیں:

اب نہ ڈھونڈ اس کو دل کی گلیوں میں
وہ ہے مصروف رنگ رلیوں میں
کون زخمی ادھر سے گزرا ہے
خون بکھرا ہوا ہے گلیوں میں
اے خدا اب تو روک بارش کو
کشتیاں چل پڑی ہیں گلیوں میں

....

پلٹ پلٹ کے وہ جب دیکھتا گیا ہے مجھے
وہی تو لمحہ تماشہ بنا گیا ہے مجھے
نہ دے وصال کے موسم کی اتنی خوشخبری
کہ اب فراق ترا راس آ گیا ہے مجھے
فصیلِ شہر پہ رکھ کر چراغ شب کی طرح
یہ کون تند ہوا میں جلا گیا ہے مجھے

پنجابی غزل کے اشعار:

ہاواں ہنجو کدے اتھرو
یاداں وچ پرونا لیے
جھیڑا دل دے اندر دے
اونوں کتے لکوے نالیے
عشق جدائیاں پا دیندا اے
بس کر ہن کھلونا لیے
بوہتا ہسنا چھوڑ دے راہی
راتاں نوں ہن رونا لیے

بریگیڈیئر (ر) صادق راہی کا میں نے بچپن اور لڑکپن دیکھا ہے میں اس وقت بچوں کے "امروز"، "مساوات"، "جگنو"، "بچوں کا باغ" میں کہانیاں لکھا کرتا تھا اور صادق راہی بچوں کا آفتاب، سنگ میل، امروز، نوائے وقت، پھول اور کلیاں، نونہال اور دیگر رسائل میں لکھا کرتے تھے۔ ان کا اپنے ننھیال میاں چنوں آنا جانا رہتا تھا۔ ایک مرتبہ بچوں کے لکھاری جاوید چنگیزی انہیں میرے پاس لے کر آئے تو سرخ و سفید رنگت کے مگر معصوم بھولے بھالے نہایت کم گو صادق راہی کو مل کر گمان بھی نہ گزرا کہ یہ آنے والے کل کو نڈر و بے باک اور بہادر بنے جذبہ حب الوطنی سے سرشار افواج پاکستان کا حصہ بن کر ہر وقت زندگی اور موت کے سائے میں بڑی جرات و دلیری سے زیست کے سفر کے راہی ہوں گے اور افواج پاکستان کے کسی بڑے عہدے پر اپنی صلاحیتوں اور ذہانت و قابلیت سے فائز ہوں گے۔ درحقیقت صادق راہی جیسی پاکستان کی ہستیاں بلاشبہ ملک و قوم کا قیمتی اثاثہ اور سرمایہ ہوتی ہیں جن پر جتنا بھی ناز کیا جائے کم ہے۔ اپنی پیشہ وارانہ نہایت ذمہ دارانہ اور حساس عسکری سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ شعر و ادب کی کھیتی کو بھی اپنے دل و دماغ، سوچ و فکر اور ہستی کے گلشن حیات میں پروان چڑھاتے رہنا اور شعر و نثر کے خوبصورت پھول زمانے پر نچھاور کرتے رہنا صادق راہی کی اعلیٰ ترین ذہنی و ذہانت کی شاندار خوبیاں یقیناً دادِ تحسین کی مستحق ہیں۔

شاعری

ابر، پانی، ہوا وجود میں ہے
کیا عجب معجزہ وجود میں ہے
موت ہے دو قدم کی دوری پر
زیست کا سلسلہ وجود میں ہے
ایک پل بھی نڈھال ہوتا نہیں
اس قدر حوصلہ وجود میں ہے
خود کو اندر سے ڈھانپ سکتا ہوں
ایک ایسی قبا وجود میں ہے
دیکھ سکتے ہو بند آنکھوں سے
ایک حیرت کدہ وجود میں ہے
شجرِ ممنوعہ چُھو کے دیکھا تھا
آج تک ذائقہ وجود میں ہے
اُس کے رُخ پر کئی ستارے ہیں
جگمگاتا دیا وجود میں ہے
کاٹتا ہے جو مجھ کو اندر سے
کون سا راستہ وجود میں ہے؟
بھید صدیوں کے کھولنے والا
کوئی درویش سا وجود میں ہے
مانگتا ہوں تو رد نہیں ہوتی
جانے کس کی دعا وجود میں ہے

نوید مرزا/لاہور

ہوا کے تیز جھونکے سے جو منظر پر رومال آیا
بھری محفل میں بیٹھا تھا کہ جھٹ تیرا خیال آیا
بڑی یادیں تھیں وابستہ وہ اک کپڑے کے ٹکڑے سے
اسے دیکھا جو یوں اڑتا تو سوچوں میں ابال آیا
اگرچہ کسمپرسی تھی، مگر، یادوں کی دولت کو
نہیں لایا تصرف میں وہ گھڑی میں سنبھال آیا
مرے ہی شہر کے باسی بنے ہیں اجنبی ایسے
کہ جیسے اس وفا پر اب زمانے میں زوال آیا
وہ معمولی علالت بھی اسے تو لے گئی بسمل
بچھڑنے کا مرے دل میں نہ بالکل احتمال آیا

عبدالوحید بسمل/ایبٹ آباد

عروجِ شب کا ہے تازہ ہدف سفینۂ شام
ستارے ایک طرف اک طرف سفینۂ شام
کنارِ آب ہوا جا رہا ہے خواب و خیال
مہیب سائے کریں گے تلف سفینۂ شام
یہ ٹمٹماتے ہوئے برقی قمقموں کا وفور
ابھی سے کرنے لگا ہے حذف سفینۂ شام
کہیں پہ ڈوبتے سورج کا بن گیا پرتو
کہیں کہیں پہ ستارا بکف سفینۂ شام
کسی دیے کو ولایت سے ہمکنار کرے
بصد نیاز ہی بخشے شرف سفینۂ شام
بچھڑنے والوں کی یادوں کو بخشے ہے مہمیز
پلک پلک پہ بکھیرے صدف سفینۂ شام
ہے جلترنگ یہ کیسی ہے کیا طرب کی نمود
بجائے جاتا ہے ساحل پہ دف سفینۂ شام
ہے بحر و بر کے مناظر میں اس طرح ٹھہرا
بچھائے بیٹھا ہے جس طرح صف سفینۂ شام
ہو کینوس یا حقیقت ہیں آشکار ظفر
کسی مقام پہ دیکھا نہ رف سفینۂ شام

انجینئر ظفر محی الدین/لاہور

خفا خفا سی نظر کا نشاں ہی دیکھنے چل
گنوا چکا ہے جہاں دل، وہاں ہی دیکھنے چل
جدید عہد کے حبس میں دم گھٹنے ہے بہت
وہ رفتگاں کے پرانے مکاں ہی دیکھنے چل
بہت دنوں سے جلائے گئے نہ گھر کے چراغ
وہ چمنیوں سے نکلتا دھواں ہی دیکھنے چل
نہ گھڑ سوار یہاں ہیں نہ شاہ کا لشکر
میوزیم میں پڑی داسیاں ہی دیکھنے چل
ہر ایک پھول میں خوشبو مہک نہیں سکتی
بہار چھوڑ، چمن میں خزاں ہی دیکھنے چل
جو خواب لے کے چلا تھا نئی زمیں کی طرف
وہ راستے میں لُٹا، کارواں ہی دیکھنے چل
نئی طرح کے مناظر ہیں آفتاب کے پاس
ندی کنارے کوئی کہکشاں ہی دیکھنے چل

آفتاب خان/لاہور

نہ مال و زر نہ تجارت سے کام چلتا ہے
ہمارا صرف محبت سے کام چلتا ہے
کبھی جو جینے کی صورت نظر نہیں آتی
تو پھر فقط تری صورت سے کام چلتا ہے
تمہارے تازہ سٹیٹس کو دیکھتے رہنا
عجب نہیں کہ فراغت سے کام چلتا ہے
تمہاری جبین کی سلوٹ میں الجھی نظروں کا
جو تم چلو تو سہولت سے کام چلتا ہے
تمہارے چہرے پہ بنتا ہے جو حسیں ڈمپل
ہمارا اس کی عنایت سے کام چلتا ہے
بنے ہوئے ہیں چھچھورے وہاں پہ سخت مزاج
جہاں پہ تیری شرارت سے کام چلتا ہے
چکا رہے ہیں وہاں پر بھی دوگنا قیمت
جہاں پہ سب کا رعایت سے کام چلتا ہے

امیر شہر، یہ حاکم، یہ وقت کے سلطان
کہ ان کا بھی کسی نسبت سے کام چلتا ہے
طلب ہماری ضرورت سے کچھ زیادہ ہے
سو اپنا ساقی کی منت سے کام چلتا ہے

اجمل ساقی / کھاریاں

حوصلے بے تکان رکھتا ہوں
ایک پیہم اُڑان رکھتا ہوں
تیرے کوچے کا ہوں گدا جب سے
بادشاہوں سی شان رکھتا ہوں
لفظ خوشبو، تو صوت جھرنوں سی
میں جو اُردو زبان رکھتا ہوں
گرچہ ذرہ ہوں خاکِ ارضی کا
وسعتِ آسمان رکھتا ہوں
اتفاقاً نہ مانگ لے کوئی
احتیاطاً یہ جان رکھتا ہوں
دوستوں کا تو دوست ہوں عاطرؔ
دُشمنوں کا بھی مان رکھتا ہوں

عاطر عثمانی / ملائیشیا

مری دھڑکن سے مل کر ناچتا ہے
مرے اندر قلندر ناچتا ہے
سمندر میں بھنور ہے یا بھنور میں
دما دم اک سمندر ناچتا ہے
تو کب کا جا چکا ہے اور ابھی تک
ترے جانے کا منظر ناچتا ہے
کہیں نکلوں تو رستے گھومتے ہیں
رہوں جو گھر میں تو گھر ناچتا ہے
زمیں پر دیکھ کر بھٹکے مسافر
ستارا آسماں پر ناچتا ہے
تھرکتی ہے لہو میں۔ اک تمنا
کوئی جذبہ مچل کر ناچتا ہے
تمہاری یاد کا بے کل پرندہ
کڑے موسم میں بے پر ناچتا ہے
زمیں پر ناچتی ہے ایک دُنیا
ہتھیلی پر مقدر ناچتا ہے

عاطر عثمانی / ملائیشیا

عشق و معشوق کے چکّر سے نکل آیا ہوں
میں جوانی کے سمندر سے نکل آیا ہوں
جدّتِ وقت کے احساس سے جلتی ہے حیات
جب تیرے سایۂ چادر سے نکل آیا ہوں
لوٹ آئی میری آنکھوں کی نظر تیرے بعد
اب میں محتاجیٔ رہبر سے نکل آیا ہوں
میری ہستی میری تقدیر سی گمنام رہے
اس لیے شام ڈھلے گھر سے نکل آیا ہوں
صورتِ یومَ یفرُّ کوئی غم خوار نہ تھا
ایسے ہنگامۂ محشر سے نکل آیا ہوں
خواب، تحریریں، ہنسی، اشک، تھکن، خاموشی
میں تیری یادوں کے دفتر سے نکل آیا ہوں
خشک ہونٹوں پہ عجب پیاس کے پہرے دیکھے
میں وہ چشمہ ہوں جو پتھر سے نکل آیا ہوں
جس کی صف بندی سے سانسوں کا چلن تھا مشکل
اُن تمناؤں کے لشکر سے نکل آیا ہوں
ذات میں اپنی مُقید نہیں رہنا تھا سو میں
پسلیاں توڑ کے اندر سے نکل آیا ہوں
شب گزیدہ ہوں مگر اس کی صدا پر عابد
وحشتیں چیر کے بستر سے نکل آیا ہوں

عابد علی رحمان / مردان

کیا رنگ اجتناب تری مخلصی میں تھا
کیا حُسنِ التفات کہ ہر کشتگی میں تھا
اک موجِ اشک خوں کی روانی کے باوجود
رنگِ سخن کہ سایۂ یک تشنگی میں تھا
دیر و حرم میں بخششِ فردا بٹی تھی جب
خلقِ خدا سے پوچھ میں تیری گلی میں تھا
اک سرکشی کی بوند تھی اس کے خمیر میں
میرا خمیر تھا کہ گندھا سرکشی میں تھا
بے لمس، روح میں بھی زمستاں کی دھوپ کا
وہ کیف اک پہر کی تری دوستی میں تھا
یاروں کی بے حسی کا تو کیا ذکر ہو مگر
کیا طرزِ دلبری تھا جو اس اجنبی میں تھا
میں خاک میں تھا پارۂ انجم ملا ہوا
کس نے کہا سکوں مجھے بے مائیگی میں تھا
اچھے رہے وہ جہلِ تن آساں میں رہ گئے
جز کرب کے، ملال کے، کیا آگہی میں تھا

پروفیسر سید ذکی نقوی / جھنگ

کیا پتہ ظلم کہ احسان کیا ہے اُس نے
اپنے دل کو مرا زندان کیا ہے اُس نے
بے سبب رونے میں تکلیف بہت ہوتی تھی
میری تکلیف کو آسان کیا ہے اُس نے
چھوڑ کر مجھ کو تمہیں اُس نے چنا حیرت ہے
یعنی نقصان پہ نقصان کیا ہے اُس نے
عشق کرنا تو کوئی جرم نہیں ہے لیکن
دوسرا پہلے کے دوران کیا ہے اُس نے
اپنی امید کے مرجھائے ہوئے پھولوں کو
میری تنہائی کا سامان کیا ہے
کر کے برباد مجھے اور مرے جیسوں کو عمیر
تا ابد دشت پہ احسان کیا ہے اُس نے

عمیر مشتاق

CamScanner

بقیہ انٹرویو: نذیر قیصر

میری خوش بختی ہے کہ میں ابتدا سے ہی معیاری ادبی پرچوں میں شائع ہونے لگا تھا۔ جن میں ''اوراق''، ''فنون''، ''سیپ''، ''ماہِ نو''، ''لیل ونہار''، ''ادبِ لطیف'' اور ''قندیل'' شامل ہیں۔

ارژنگ: اپنی تصانیف کے بارے بتایئے کون سی کتاب خود آپ کو سب سے زیادہ محبوب ہے۔

نذیر قیصر: میری پہلی کتاب آنکھیں چہرہ ہاتھ 1968ء میں شائع ہوئی۔ یہ عہد ''برگِ نے'' (ناصر کاظمی) ''آبِ رواں'' (ظفر اقبال) ''صدف'' (شہزاد احمد) اور ''تیز ہوا اور تنہا پھول'' (منیر نیازی) کا عہد تھا۔ بقول شہزاد احمد: ''جس وقت نذیر قیصر نے شاعری کی سرزمین پر پاؤں رکھا اس وقت یہ زمین دلدلی ہو چکی تھی اور بہت سے نئے شاعر اس میں دھنس چکے تھے۔ مگر نذیر قیصر نے نہ صرف اس دلدلی سرزمین پر اپنے پاؤں جما لیے بلکہ اپنے پاؤں کے نشان بھی ثبت کر دیے۔''

''آنکھیں چہرہ ہاتھ'' نے شائع ہوتے ہی شاعری کی فضا میں ایک گہری لہر پیدا کر دی۔ سجاد باقر رضوی نے لکھا کہ نذیر قیصر نے نہ صرف نئی نسل کو متاثر کیا ہے بلکہ ان کی شاعری کا پرتو سینئر شعرا پر بھی نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔'' پہلے دو تین برس میں ''آنکھیں چہرہ ہاتھ'' کے 8 ایڈیشن شائع ہوئے اور اب نواں ایڈیشن چھپا ہے۔ ''آنکھیں چہرہ ہاتھ''، ''اے شام ہم سخن ہو''، ''محبت میرا موسم ہے'' اور ''دوپہر کا چاند'' میری پسندیدہ کتابیں ڈاکٹر وحید احمد تو کہتے ہیں کہ ہم نے ان کتابوں کے دیباچوں سے بھی بہت کچھ سیکھا ہے اور آج کل وہ میرے تمام دیباچے، خطوط اور فلیپ بھی کتابی صورت میں مرتب کر رہے ہیں۔

ارژنگ: کسی ادبی تحریک کا بھی کبھی حصہ رہے ہیں۔ کیا اہل قلم کو سیاست میں حصہ لینا چاہیے؟

نذیر قیصر: کبھی کسی ادبی تحریک کا باقاعدہ حصہ نہیں رہا۔ کیونکہ ہمارے ہاں ادبی تحریکیں نظریاتی کم ہیں گروہ بندی کا شکار زیادہ ہیں۔ میں خود کو ''پبلک پراپرٹی'' سمجھتا ہوں۔ مجھے سب اچھے لگتے ہیں۔ میری شاعری اور زندگی کا فلسفہ میرے ان دو شعروں میں ہے:

دنیا اچھی لگتی ہے اب اچھا لگتا ہے
اچھی آنکھوں والوں کو سب اچھا لگتا ہے
ساری کتابیں سارے صحیفے مجھ پر اُترتے ہیں
مجھ کو دنیا کا ہر مذہب اچھا لگتا ہے

آنکھیں اچھی ہوں تو خواب بھی اچھے آتے ہیں۔ جیسا آپ سوچتے ہیں ویسا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ آپ کے خیال تو آپ کا چہرہ تراشتے ہیں۔ ہمارے ملک میں عملی سیاست کرنا بہت مشکل ہے شروع میں پیپلز پارٹی سے تعلق رہا۔ بھٹو صاحب اور بے نظیر بھٹو سے ملاقاتیں بھی رہیں۔ میری کتاب تیسری دنیا کا فلیپ بھی بھٹو صاحب نے لکھا ہے۔ ''اہل قلم کو سیاست میں فکری سطح پر حصہ لینا چاہیے۔ عملی طور پر تخلیقی کام کے متاثر ہونے کا اندیشہ ہے۔

ارژنگ: کیا یہ تاثر درست ہے کہ الیکٹرانک میڈیا کی وجہ سے کتاب سے دوری کا رواج عام ہوتا جا رہا ہے۔

نذیر قیصر: الیکٹرک میڈیا کی وجہ سے کتاب کے مطالعے اور فروغ پر کوئی منفی اثر نہیں پڑا۔ 1960ء میں لاہور کی اشاعتی مارکیٹ میں چند پبلشر دکھائی دیتے ہیں آج اردو بازار کے علاوہ صفانوالہ چوک تک فوڈ سٹریٹ کی طرح کئی بک سٹریٹ نظر آتی ہیں جو آباد بھی رہتی ہیں۔ ہم ہر شعبے میں کچھ منفی مفروضے گھڑ لیتے ہیں پھر انہیں دہراتے رہتے ہیں۔ کل کے مقابلے میں آج کتابیں زیادہ چھپتی ہیں۔ زیادہ بکتی ہیں۔ الیکٹرک میڈیا نے کتاب کا راستہ روکنے کی بجائے اسے فروغ دیا ہے۔

ارژنگ: شعروادب کی ترویج میں مشاعرے کی کیا اہمیت اور کردار ہے؟

نذیر قیصر: شاعری کے فروغ کے لیے مشاعرہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ مشاعرے میں شاعر اور اس کی شاعری ان عام لوگوں تک بھی جاتی ہیں جو شاعری پڑھتے ہیں اور اچھی شاعری سننے کے بعد وہ شاعری پڑھنے بھی لگتے ہیں۔ مشاعرے کی فضا شاعری کو آگے بڑھانے کے لیے ایک خاص دوستانہ ماحول پیدا کرتی ہے۔ مشاعرے ہونے چاہئیں اور بہت ہونے چاہئیں۔ ہمارے علمی ادبی اداروں اور تعلیمی اداروں

CS CamScanner

کی ذمہ داری ہے کہ وہ معیاری مشاعروں کا اہتمام کرتے رہا کریں۔

ارژنگ: تمام زندگی آپ نے پڑھنے لکھنے اور پڑھانے میں بسر کی ہے۔ اگر مالک نئی زندگی عطا کر دے تو پھر بھی یہی کام کرنا پسند کریں گے؟

نذیر قیصر: مجھے اگر دوبارہ زندگی ملے تو میں پھر بھی نذیر قیصر ہی بننا چاہوں گا اور جو نظمیں غزلیں میں اس جنم میں نہیں لکھ سکا انہیں لکھوں گا اور وہ محبتیں جو ادھوری رہ گئیں انہیں پورا کرنے کی کوشش کروں گا۔ ایک بار میں نے فیض صاحب سے پوچھا کہ آپ کی کئی نظموں کے آخر میں آپ نے لکھا ہے نا تمام۔ ایسا کیوں ہے؟ کہنے لگے کہ ہمیں کچھ نظمیں لکھ کر لگا کہ کچھ کہنے کو رہ گیا ہے'' یہی پیاس ہے جو زندگی میں کہیں نہ کہیں رہ جاتی ہے۔ کوئی نظم ادھوری رہ جاتی اور کوئی محبت بھی۔ شاعری کے علاوہ آئندہ زندگی میں گلوکار بھی بننا چاہوں گا۔ میڈم نور جہاں نے ایک بار مجھے گاتے سنا تو بہت حیران ہوئیں۔ کہنے لگیں کہ اگر آپ نے گانا نہ گایا تو یہ آپ کا اپنی آواز اور پاکستان کی موسیقی پر بڑا ظلم ہوگا۔''

ارژنگ: تخلیقیت کیا ہے؟ ایک اچھے تخلیق کار سے آپ کی کیا مراد ہے؟

نذیر قیصر: تخلیق کا اولاؤ اور بہاؤ آپ کے اندر بھی ہوتا ہے اور باہر بھی جو کچھ آپ اپنے باہر لکھتے ہیں وہ آپ کے اندر بھی لکھا جا رہا ہوتا ہے۔ شاعر وہ وہاں سے بھی کاٹتا ہے جہاں اس نے بویا نہیں ہوتا۔ وہ وہاں سے بھی جمع کرتا ہے جہاں اس نے بکھیرا نہیں ہوتا۔ تخلیقی عمل جتنا عملی ہے اس سے کہیں زیادہ غیر عملی ہے۔ یہ آدھے جاگے آدھے سوئے ہوئے آدمی کا عمل ہے جس طرح صبح کاذب کی نیم تاریکی میں خاموشی سے پھول کھلتے ہیں جس طرح بچہ سوتے میں مسکراتا ہے۔ جس طرح موسیقی میں زبان میں دوسروں کے درمیان جو غیر محسوس سا وقفہ ہے جسے مشروتی کہتے ہیں۔ ایک سنی ان سنی آواز جو موجود ہوتی ہے۔ ہر کان کو سنائی نہیں دیتی۔ ہر منظر بھی ہر آنکھ پہ نہیں کھلتا۔ باہر بھی دریا اس کو دکھائی دیتا ہے جس کے اندر دریا ہوتا ہے۔ تخلیق ظاہر اور باطن کے درمیان کہیں خواب کی طرح ہوتی ہے جسے چھو کر مجسم کرنا پڑتا ہے اور یہ تخلیقی لمس ہر ہاتھ میں نہیں ہوتا۔

ارژنگ: عملی زندگی کا آغاز کب اور کہاں سے کیا؟

نذیر قیصر: عملی زندگی میں بہت سے مختلف کام کیے سب سے لاہور میں آ کر ناصر کاظمی کے حوالے سے حنیف رامے کے ساتھ ان کے میگزین ماہنامہ نصرت میں کام کیا۔ پھر ماہنامہ ڈائریکٹر اور شمع کا ایڈیٹر رہا پھر فلموں کے گیت لکھے۔ فلم سنسر بورڈ کا ممبر رہا۔ ملتان میں ایک نجی ادارے کا ڈائریکٹر رہا اور تقریباً پندرہ برس تک پڑھایا۔ عملی زندگی مختلف جہتوں میں بہتی رہی ہے۔

ارژنگ: کسی لکھاری کو لکھنے کی تحریک کہاں سے ملتی ہے؟

نذیر قیصر: ہر تخلیق کار کے ذاتی تجربات اور شہادات بنیادی حیثیت رکھتے ہیں مگر اکثر تخلیق کاروں کے تجربات اور شہادات اُن کی تخلیق کا حصہ نہیں بن پاتے۔ کیونکہ ان کی حیثیت سطحی ہوتی ہے جو کچھ دیکھا سنا اُسے ویسے ہی دہرا دیا۔ خبرنامہ اور کشف نامے میں فرق ہوتا ہے اور ہونا چاہیے۔ ساحر لدھیانوی نے کہا تھا:

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

جو کچھ کسی نے دیا ہو اُسے ویسے ہی نہیں لوٹانا چاہیے اس میں کچھ اضافے کے ساتھ اُسے لوٹانا چاہیے اگر آپ مجھے گلدان دیتے ہیں تو میں اُسے خالی نہیں لوٹاؤں گا۔ میں اُس میں شاخِ گلاب لگا کر آپ کو واپس کروں گا۔

ارژنگ: کیا کھویا کیا پایا؟

نذیر قیصر: میں نے بہت کھویا، بہت زیادہ پایا۔ چھوٹی سی زندگی میں خوابوں جیسی شاعری اور محبت حاصل کی اور پھر یہ شاعری اور محبت پھیل کر ایک کائنات بن گئی جو کچھ میں نے کھویا وہ بھی اسی کائنات میں شامل ہو کر میری شاعری بن گیا۔ میں نے خدا، کائنات اور خود کو فطرت کے حوالے سے دیکھا ہے فطرت سے ایک نیا رشتہ قائم کیا ہے جب آپ فطرت سے براہِ راست تعارف کرتے ہیں تو فطرت آپ کو کبھی مایوس نہیں کرتی داخل ہونے والوں کے لیے اس کے پھاٹک ہمیشہ کھلتے رہتے ہیں۔

ارژنگ: آج کل کیا لکھ رہے ہیں، مستقبل کے کیا منصوبے اور ارادے ہیں؟

نذیر قیصر: آج کل میں اپنی کلیات پر کام کر رہا ہوں۔ پھر سوانح عمری ہے۔ ایک پنجابی شعری مجموعہ ہے اور اردو کی نئی شاعری بھی۔ ان کے علاوہ ایک مشکل ناول ہے ''یسوع'' سوانح عمری بھی مشکل کام ہے۔ میں سچا آدمی ہوں شاعری کی طرح آپ بیتی میں بھی جو کہوں گا سچ کہوں گا۔

بقیہ انٹرویو: عمران شناور

ارژنگ: اپنے بارے میں بتائیے، آپ کا تعلق کہاں سے ہے اور آپ کی ادبی وابستگی کی ابتدا کیسے ہوئی؟

عمران شناور: میرا پورا نام محمد عمران اور والد صاحب کا نام محمد حنیف ہے۔ میں 14 مارچ 1983ء کو بہاول پور میں پیدا ہوا جہاں میرا ننھیال ہے۔ بچپن کا کچھ عرصہ یہیں گزرا اور پھر چشتیاں ضلع بہاول نگر اپنے ددھیال منتقل ہوگئے۔ گورنمنٹ ماڈل ہائی سکول چشتیاں سے میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ گورنمنٹ ڈگری کالج چشتیاں میں داخلہ لیے چند ہی ماہ گزرے تھے کہ غمِ روزگار نے آلیا۔ یہ بوجھ سر پہ اٹھائے لاہور آ گیا اور معروف شاعر سعد اللہ شاہ صاحب کے ادارہ سعد پبلی کیشنز پر بطور کمپیوٹر آپریٹر جاب شروع کی۔ یہاں معروف شاعروں، ادیبوں کا تانتا بندھا رہتا اور سارا دن شاعری کی محفل جمی رہتی جس نے میرے شوق کو جلا بخشی۔

ارژنگ: شاعری کی طرف آپ کو کس نے یا کس چیز نے مائل کیا؟

عمران شناور: درسی کتب میں شاعری شوق سے پڑھتا تھا۔ سوشل میڈیا سے پہلے اخبارات اور میگزینز کا زور و شور تھا۔ میری توجہ کا مرکز منتخب اشعار اور غزلیں تھیں۔ میں اپنی پسند کے اشعار کاپی میں نوٹ کر لیا کرتا تھا جو کہ اب بھی میرے کاغذات میں موجود ہے۔ لاہور منتقل ہونے کے بعد چاروں طرف کتب کا انبار تھا تو فارغ وقت میں کوئی نہ کوئی کتاب میرے زیرِ مطالعہ رہتی تھی۔ چونکہ میں کمپوزنگ کا کام کرتا تھا تو شائع ہونے والی کتب پہلے میرے ذوق کی تسکین کا باعث بنتی تھیں اور یہ سلسلہ اب بھی جاری و ساری ہے۔

ارژنگ: آپ کے نزدیک شاعر بننا ایک انتخاب تھا یا یہ ایک داخلی ضرورت اور کیفیت تھی؟

عمران شناور: شاعر یا تو ہوتا ہے یا نہیں ہوتا۔ اس میں درمیانی راستہ کوئی نہیں۔ شاعری کو اپنے لیے منتخب نہیں کیا جا سکتا۔ شاعری خود آپ کو اپنے لیے منتخب کرتی ہے۔ اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ میں نے ضرورت کے تحت شاعری کا انتخاب کیا۔ انسان کے اندر شاعر موجود ہو تو وقت کے ساتھ ساتھ ظاہر ہو جاتا ہے۔

ارژنگ: اپنے پہلے شعری مجموعے کے بارے میں کچھ بتائیے۔ اس مجموعے کا عنوان کیسے چنا گیا اور یہ عنوان آپ کی شاعری کے مزاج کو کس طرح بیان کرتا ہے؟

عمران شناور: میرا پہلا شعری مجموعہ "ابھی مت ٹوٹنا اے خواب میرے" کے نام سے مئی 2013ء میں شائع ہوا جس میں غزلیں، نظمیں، قطعات شامل ہیں۔ استادِ محترم باقی احمد پوری، محترم سرور ارمان اور محترم سعد اللہ شاہ کی مشاورت سے چنیدہ ناموں میں سے ایک نام فائنل ہوا اور معروف ڈیزائنر عبید اللہ صاحب نے اس کا سرورق ڈیزائن کیا۔ جہاں تک مزاج کا تعلق ہے تو اس مجموعہ کا تمام کلام میرے مزاج کی ترجمانی کرتا ہے۔

ارژنگ: اس مجموعے میں شامل نظمیں/غزلیں کب اور کس دورانیے میں لکھی گئیں؟ کیا ان میں آپ کے زندگی کے مختلف مراحل جھلکتے ہیں؟

عمران شناور: لاہور منتقل ہونے کے بعد چونکہ بھرپور ادبی ماحول میسر رہا تو چند ماہ بعد ہی طبع آزمائی شروع کر دی۔ 2003ء سے 2013ء تک کے عرصہ میں لکھی شامل غزلیں نظمیں اس مجموعہ کلام میں شامل ہیں۔ چند طرحی غزلوں کے علاوہ تمام کلام میری زندگی کے مختلف مراحل اور مختلف کیفیات کا ترجمان ہے۔

ارژنگ: اس شعری مجموعے کی اشاعت کے دوران آپ کو کن مشکلات یا خوشگوار تجربات سے گزرنا پڑا؟

عمران شناور: شعری مجموعے کی اشاعت کے دوران مجھے کسی قسم کی رکاوٹ یا مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ سعد اللہ شاہ صاحب اور پیارے دوست ڈاکٹر صغیر صفی کے تعاون سے میرا شعری مجموعہ کتابی صورت میں منظرِ عام پر آیا۔

ارژنگ: آپ کے نزدیک شاعری کا اصل مقصد کیا ہے؟ تفریح، احتجاج، یا خود کلامی؟

عمران شناور: انسان کی اندرونی کیفیات کو منظم انداز میں صفحہ قرطاس پر منتقل کرنے کا نام شاعری ہے۔ شاعری احتجاج ہے تفریح نہیں۔

ارژنگ: آپ کے اسلوب پر سب سے زیادہ اثر کن شعرا یا ادبی روایات کا رہا ہے؟

عمران شناور: میرے شعری اسلوب پر کسی ایک شاعر کی چھاپ بالکل نہیں ہے۔ تھوڑا تھوڑا حصہ تمام شاعروں نے ڈالا ہے جن کو میں نے پڑھا، سنا اور

محسوس کیا۔

ارژنگ: آپ کے خیال میں نوجوان نسل کی شاعری اور کلاسیکی شاعری میں بنیادی فرق کیا ہے؟

عمران شناور: کلاسیکی شاعری کا نوجوان نسل کی شاعری سے کوئی موازنہ نہیں۔ آج کل کی شاعری میں مقصدیت نام کی کوئی چیز نظر نہیں آتی۔

ارژنگ: موجودہ دور کے معاشرتی مسائل (غربت، بے روزگاری، تنہائی، سوشل میڈیا وغیرہ) آپ کی شاعری میں کس حد تک جھلکتے ہیں؟

عمران شناور: میرے کلام کی اوک سے آپ کو موجودہ دور کے چیدہ چیدہ معاشرتی مسائل جھلکتے نظر آئیں گے۔

ارژنگ: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ شاعر کا سماجی کردار بھی ہوتا ہے، یا شاعر صرف تخلیقی دنیا کا مسافر ہے؟

عمران شناور: شاعر کا سماجی کردار بہت ضروری ہے۔ کیونکہ اللہ پاک نے عام انسانوں سے زیادہ شعور عطا کیا ہوتا ہے تو شاعر کو چاہیے کہ سماج کے لیے کارآمد ثابت ہونے کی کوشش کرے۔ لوگوں کو اپنی شاعری میں اچھے برے میں فرق کرنے میں مدد کرے۔

ارژنگ: آج کل ادبی رسائل اور سوشل میڈیا پر شاعری کی اشاعت کے رجحان کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

عمران شناور: ادبی رسائل میں شاعری کی اشاعت قابلِ داد ہے۔ ادبی رسائل کی نسبت سوشل میڈیا پر شاعری کی ترسیل زیادہ ہے۔ ایک کلک پر کلام پوری دنیا میں پھیل جاتا ہے۔

ارژنگ: آپ کی شاعری کے بارے میں قاری یا ناقدین کا پہلا ردعمل کیسا رہا؟

عمران شناور: میری شاعری کے بارے قارئین اور ناقدین کا ملا جلا ردعمل آیا۔

ارژنگ: ایک نوجوان شاعر کے طور پر آپ آنے والے وقت میں کس موضوع پر زیادہ لکھنا چاہتے ہیں؟

عمران شناور: نوجوان شاعر کے طور پر آنے والے وقت میں اپنے کتھارسس کے ساتھ ساتھ معاشرتی مسائل پر لکھنے کی کوشش کروں گا۔

ارژنگ: آپ اپنی تخلیقی توانائی کو کیسے تازہ رکھتے ہیں؟ کیا مطالعہ، مشاہدہ، یا تنہائی کا عمل زیادہ اثرانداز ہوتا ہے؟

عمران شناور: تخلیقی توانائی کو تازہ رکھنے کے لیے مطالعہ کرتا ہوں۔

ارژنگ: نوجوان لکھنے والوں یا شاعری شروع کرنے والے طلبہ کے لیے آپ کیا پیغام دینا چاہیں گے؟

عمران شناور: نوجوان لکھنے والوں کے لیے یہی پیغام ہے کہ مطالعہ تخلیق کے لیے آکسیجن کا کام کرتا ہے تو آپ کی زیادہ سے زیادہ آکسیجن لیجیے۔

ارژنگ: اپنے شعری مجموعے سے کوئی منتخب شعر/غزل یا قطعہ ہمارے قارئین کے لیے

عمران شناور: میں اپنی شاعری میں سے چند منتخب اشعار پیش کرتا ہوں:

کچھ تو اے یار! علاجِ غمِ تنہائی ہو
بات اتنی بھی نہ بڑھ جائے کہ رسوائی ہو

....

ستارے سب مرے، مہتاب میرے
ابھی مت ٹوٹنا، اے خواب میرے

....

لوگ پابندِ سلاسل ہیں مگر خاموش ہیں
بے حسی چھائی ہے ایسی گھر کے گھر خاموش ہیں

پیش خیمہ ہے شناورؔ یہ کسی طوفان کا
سب پرندے اڑ گئے ہیں اور شجر خاموش ہیں

....

انجان لگ رہا ہے مرے غم سے گھر تمام
حالاں کہ میرے اپنے ہیں دیوار و در تمام

....

آنکھ سے آنسو نہیں بہتے کبھی
دل میں جب تک حوصلہ موجود ہے
حوصلہ بھی کام کب آیا مرے
حوصلہ بس نام کا موجود ہے

آخر میں ایک نظم "شناور"

خلا میں غور سے دیکھوں
تو اک تصویر بنتی ہے
اور اس تصویر کا چہرہ
ترے چہرے سے ملتا ہے
وہی آنکھیں، وہی رنگت
وہی ہیں خال و خد سارے
مری آنکھوں سے دیکھے تو
تجھے اس عکس کے چہرے پہ
اک تل بھی دکھائی دے
جو بالکل تیرے چہرے پر
سجے اُس تل کے جیسا ہے
جو گہرا ہے، بہت گہرا
سمندر سے بھی گہرا ہے
کہ اس گہرائی میں اکثر
شناورؔ ڈوب جاتا ہے

شاعری

خود کو ہم سامنے بٹھاتے ہیں
اور پھر حوصلہ بڑھاتے ہیں
کیا یہ کم ہے کہ بھیڑ میں ہم لوگ
روز اک راستہ بناتے ہیں
پیار کی جب بھی اوس پڑتی ہے
دل کی شاخوں پہ پھول آتے ہیں
عمر کا ایک سال کم ہوا ہے
آؤ مل کر خوشی مناتے ہیں
جائیے عہد کیا نبھائیں گے آپ
آپ تو نام بھول جاتے ہیں
ہو بھی سکتا ہے دل بدل جائیں
آؤ کچھ دیر مسکراتے ہیں
جب خزاؤں کا رقص ہوتا ہے
ہم بہاروں کے گیت گاتے ہیں
کون ہے جس کو آزمایا نہیں
آیئے خود کو آزماتے ہیں

زاہد محمود زاہد/ملتان

اس نے ہی دیکھ لینا گوارا نہیں کیا
ورنہ کسی کو ہم نے ستارہ نہیں کیا
میں نے کہا کہ جائیں جہنم میں بے وفا
میں نے تمہاری سمت اشارہ نہیں کیا
رونے پہ آنکھیں چومنے والے ذرا بتا
تو نے تو یہ کنواں مرا کھارا نہیں کیا؟
موسم نے پیڑ سبز کیے اس نے اپنا دل
لیکن کسی نے کچھ بھی ہمارا نہیں کیا
ہر ایک بے وفا ہے کسی کی کہانی میں
اپنی طرف کسی نے اشارہ نہیں کیا
دریا کے پار دیکھ چکے تھے علیم ہم
یونہی تو کشتیوں سے کنارا نہیں کیا

علیم عالم/لاہور

ہوا جب آج میں شامل تو کل نے گھیر لیا
میں صبر کرنے لگا تھا کہ پھل نے گھیر لیا
میں تیرے بعد ترا ہجر بھی نبھا نہ سکا
وجہ یہ تھی ترے نعم البدل نے گھیر لیا
ہزار پھول مرے واسطے کھلے ہوئے تھے
پر ایک سادہ و رنگیں کنول نے گھیر لیا
تمام دن مری سوچوں میں تھا غزال بدن
سو رات ہوتے ہی مجھ کو غزل نے گھیر لیا
پھلانگ ڈالی کٹھن زندگی پھر آخرکار
حیات جینے کا سوچا، اجل نے گھیر لیا
میں سوچ میں ہوں پڑا کس کا ساتھ دوں فائق
دل و دماغ کی جنگ جمل نے گھیر لیا

علیم فائق/لاہور

کنواری بیٹیاں رکھتی نزاکتیں کب تک
پرانی چیزوں کی بڑھتی ہیں قیمتیں کب تک
پھر اک ہجوم نے سر پر اٹھا لیا مجھ کو
مرے سرہانے پہ ہوتی تلاوتیں کب تک
پٹخ کے توڑ دیا آئنے کو گالی دی
ہم ایک دوجے کو دیتے وضاحتیں کب تک
ہمارے گھر کے ہر اک فرد کو کمانا پڑا
ہمارے بچے بھی کرتے شرارتیں کب تک
خدا نے اس لیے بولا کہ بے نیاز ہے وہ
اب اِس زمین پہ اتریں ہدایتیں کب تک
کسی نے پہلو کسی نے خیال کھینچ لیا
سنبھال رکھتا میں تیری امانتیں کب تک
بچھڑ کے اب کسی کا اعتبار توڑ دیا
گھریلو چیزوں پہ کرتے قناعتیں کب تک

حارث جمیل

دنیا تیری ہر اک صورت دیکھی بھالی لگتی ہے
اب تو کوئی حال بھی پوچھے، مجھ کو گالی لگتی ہے
شہوت کی اک ایسی عینک اب ہے سب کی آنکھوں پر
جس سے شہر کی ہر اک عورت کوٹھے والی لگتی ہے
روٹی میں سوراخ ہوا تو اک مزدور کی بیٹی، یہ
فوراً اپنے باپ سے بولی، کان کی بالی لگتی ہے
پیسوں سے تعلیم خریدی، پیسوں سے ہی جاب ملی
سولہ سالہ اپنی ڈگری مجھ کو جعلی لگتی ہے
اس کے گاؤں کی مٹی میں بھی، ایک انوکھا جادو ہے
کیکر بو کر آتا ہوں میں لیکن ٹالی لگتی ہے
خود ہی بسنے آ جاتے ہیں کمرے میں آسیب کئی
لوگوں کو خونخوار بلا یہ، میری پالی لگتی ہے
کیسی کالک ملتی ہے یہ غربت بچی عمروں پر
اچھی خاصی گوری لڑکی سب کو کالی لگتی ہے
اک دن سب کو لے جا کر میں وحشت سے ملواؤں گا
گھر کی اوپر والی منزل، جن کو خالی لگتی ہے

فیضان احمد فیضی/لاہور

سنائیں کس کو حالِ دل نہاں اپنا
نہیں ہے رازداں بھی رازداں اپنا
خودی سے ہو شناسا، کیا تیری عظمت
تو پہچان لے، زمن اپنا زماں اپنا
نصیبوں میں مرے، آہیں جفائیں ہیں
مٹاؤں کیسے نالہ و فغاں اپنا
بچھڑ کر والیٔ یثرب سے اب کیسے
چلاؤں اسپ اپنا، کارواں اپنا
مجھے کیا غم، مجھے کب مل سکی عظمت
مگر یہ روح نے پایا نشاں اپنا
خدا تو تھا ہی کب اپنا، رہی نہ پر
زمیں اپنی، رہا کب آسماں اپنا
ایاز اب وصلِ جاناں بھول جائیں ہم
کہاں اُن کا مکاں، گھر ہے کہاں اپنا

ایاز احمد/لاہور

CamScanner

گدر ویٹرنری میڈیسن سٹور

نوید عائل/مردان

دو ہزار سال قبل علم کا بہت بڑا مرکز جو ۱۸۰۰ قبل مسیح میں گندھارا ثقافت کا گھر تھا، جہاں ہندوں کی مقدس کتابیں رامائن، وید، اور مہابھارت تخلیق ہوئی، جہاں بدھ مت کے بانی گوتم بدھ پیدا ہوئے، جہاں کی پہاڑوں سے مہاتما گوتم بدھ نے امن کی صداؤں کو بلند کیا جی ہاں پاکستان کے امیر ترین ضلع مردان کی بات ہورہی ہیں شہر مردان سے ۲۰ کلومیٹر دور ایک قصبہ گدر واقع ہے جہاں چند سیکولر، چند راسخ العقیدہ مسلمان، اہل دانش، متحمل مزاج اور چند ٹوٹے پھوٹے خوابوں کے بیوپاری " گدر ویٹرنری میڈسن اسٹور "میں بھیٹک کرتے۔۔۔

اکیسویں صدی کے اس مادی دور میں آپ نے وہ عمارتیں دیکھی ہوگی جن میں ساری عمارت تیرگی میں سرتا پا غرق ہوتی ہے مگر چند کھڑکیاں روشن ہوا کرتی ہیں جو بتاتی ہیں کہ یہاں زندگی ہے، روشنی ہے اور یہاں آسیب نہیں انسان رہتے ہیں ایسا ہی ایک گلشن زاہد(ڈاکٹر) کا " گدر ویٹرنری میڈیسن سٹوتھا۔۔۔

سڑک کے کنارے ایک بورڈ آویزاں تھی جس پر اعلی نسل کے گھوڑے، بھینس، بکری دور سے نمودار ہوتے، سٹور کے اندر اعلی نسل کے گھوڑوں کی تصاویر دیواروں کی زینت تھی جیسے یہاں گھوڑوں کی ماڈلنگ ہورہی ہوں۔۔۔

وہاں جانا تو جانوروں کے مالکان یا جانوروں کو چاہیے تھا مگر ہم کیوں گئے یہ ایک معمہ ہے۔۔۔

ہم نے یہ بھی خیال نہیں کیا کہ چند بیماریاں ڈاکٹر اور مریض کے درمیان راز ہوا کرتی ہے بھلا ہمارے سامنے جانور کیسے یہ راز افشکار کرسکتی ہے۔۔۔شاید یہی وجہ تھی کہ جانوروں نے احتجاجاً یہاں کا رخ کرنا چھوڑ دیا تھا یا بیمار ہونا چھوڑ دیا تھا۔۔۔

ڈاکٹر زاہد کا خیال تھا کہ بھلا ایسا بھی کوئی گھر ہے جس میں ایک نہ ایک پالتو جانور نہ ہو . گائے نہیں تو بھینس، بھیڑ نہیں تو بکری . کتا نہیں تو بلی، گھوڑا نہیں تو گدھا . مگر مذکورہ جانوروں میں خود ایک بھی ڈاکٹر صاحب کے گھر میں موجود نہیں۔۔۔

مگر جس طرح لکھنو ہندوستان کی تہذیبی جنت ہے اسی طرح علم کے معاملے میں گدر ویٹرنری میڈیسن سٹور شیراز، سیاسی بحث و مباحثہ کیلیے پارلیمنٹ، علاقائی سماجی اور تہذیبی گفت وشنید کیلیے جرگے سے کم نہ تھا۔

☆ اس مجلس کی نمایاں خصوصیت یہاں بیٹھے ہوئے مختلف العمر شخصیات اور مختلف نظریات و افکار سے تعلق رکھنے والوں کی تھی۔

☆ یہاں ادبی، سماجی، سیاسی، علاقائی، بین الاقوامی اور تہذیبی امور پر مکالموں کی نشستیں ہوتی رہی۔

☆ یہاں بعض دوست ڈیلی ممبر کی حیثیت سے آتے تھے جب کہ بعض ویزیٹنگ ممبر تھے۔

☆ اسی ٹھکانے پر سینکڑوں کتابوں کا تبادلہ ہوا اور اس پر مفصل گفت وشنید ہوئی جن میں سائل الرحمان، ڈاکٹر زاہد، مختار مہمند، اظہر خٹک اور نا چیز نمایاں رہے۔

☆ یہاں کی نمایاں وصف یہاں بیٹھے ہوئے دوستوں کا یہ رویہ کہ یا تو پڑھتے رہے یا لکھتے رہے یا بولتے رہے گویا ان مختصر چار دیواروں میں چپ رہنے کا سکت نہیں تھا۔

☆ یہاں انس، جن مقدر، قسمت، حالات، مشکلات، جنت، دوزخ ایسے سوالات چھیڑے گئے جن کے جوابات شروع سے لے کر آج تک انسان ڈھونڈتا رہا ہے اور ڈھونڈتا رہے گا۔

☆ معاشرتی ڈائنمکس تبدیل ہونے پر اور معاشرتی بگاڑ کے محرکات اور اسباب وعلت کا موضوع اکثر میں نے اٹھایا۔۔۔اگر چہ اکثر تو ایک دوسرے کے دلائل صبر وتحمل سے سنتے رہے مگر بعض مرتبہ تو فساد ہوتے ہوتے بچ گیا شاید یہی وجہ ہے کہ کبھی راہ چلتے جانور کھڑے ہوکر تماشا دیکھتے کہ دیکھیں تو سہی !! کیسے بگڑے ہوئے آدمی ہے، اچھے خاصے اور ہٹے کٹے۔۔۔نہ صرف آدمی بلکہ اشرف المخلوقات بھی۔۔۔مگر اس قدر بگڑے کہ سب کچھ بگاڑ کر رکھ دیا۔۔۔

ملکی حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہنا بجا ہے کہ یہاں لوگوں کی آنکھوں میں حسرتوں کا راج دکھائی دیتا ہے بلکہ کب کہ لوگوں کے معاش کا شمع بجھ کر دھواں دے رہی ہے۔ڈاکٹر زاہد کو بھی یہی گلہ ہے کہ بستی اور مضافات میں لوگوں نے زیادہ سے زیادہ بھینس، گائے اور بکریاں کیوں نہیں پالے اور جنہوں نے پالے وہ بیمار کیوں نہیں ہوئے۔۔۔

خیر زاہد باکمال انسان ہے جو زندگی گزارنے کا ڈھنگ جانتا ہے مگر دوستوں کو ڈرنے کی ضرورت نہیں گدر ویٹرنری میڈیسن سٹور کے سامنے والی عمارت کے اوپر والے حصے کو گدر پاک ٹی ہاؤس کا درجہ دے کر سیاسی، سماجی، علاقائی اور بین الاقوامی گفت وشنید مکالے اور اور نشست و برخاست جاری رہے گی۔

☆☆☆

دُکھ گھات لگائے بیٹھا ہے

فائزہ صابری نوا/ لاہور

کھلی کھڑکی میں نیلا پردہ اپنی مخصوص لَے پہ محوِ رقص تھا، اور باہر سے منظر کا ایک مخصوص حصہ دِکھ رہا تھا۔۔۔ ادھورا منظر۔۔۔ لیکن تمہارے میرے یوں چیخنے، جھگڑنے سے بھی اس کے ردھم میں کچھ فرق نہ پڑا۔۔۔ وہی مخصوص لَے۔۔۔ وہی دھیما رقص۔۔۔ خاموشی کا چاروں طرف راج ہو گیا تو چڑیوں کی دھیمی دھیمی گھٹی گھٹی چہکار کان پڑنے لگی جیسے دھیرے دھیرے ایک دوسرے کے کانوں میں ہماری تمہاری باتیں کر رہی ہوں۔ شاید! اس پل تم بھی میری طرح سے سوچ رہے تھے، کہ کیا مل گیا ہمیں اس قدر جھگڑ کے!! ایک دوسرے کے اعتماد کے یوں پرخچے اڑا کے!! موضوع بھی کیا تھا!! وہی پانچ ماہ پرانا گھسا پٹا۔۔۔ تمہاری پھوپھی زاد۔۔۔ تمہاری کائنات۔۔۔ جانے کیوں تم مجھ سے اس کے طلب گار رہے جو میری برداشت سے باہر تھا، جس لڑکی نے مجھ پہ ترس نہیں کھایا۔۔۔ جس نے میرے ساتھ ہمدردی نہیں برتی۔۔۔ تم اس کو ہی طلب کرتے رہے ہو۔۔۔ حاشر! کبھی کبھی ہمارے لیے کتنی مشکلات کھڑی ہو جاتی ہیں، جیسے تمہارے لیے میں، میرے لیے کائنات۔

تم نے کبھی سوچا!! محبت مجبوری ہی تو ہوتی ہے، نہ ہوتی تو انسان "کبھی مجبور نہ ہوتا"۔

میری آنکھوں اور تمہارے حلق میں آنسوؤں کا راج ہو گیا۔۔۔ تم نے سکوت توڑا، روحا!! میں تم سے آخری بار پوچھ رہا ہوں تم مجھے اجازت دو گی یا نہیں؟؟ تم نے مجھ سے فیصلہ کن لہجے میں پوچھا تو میں نے بھی اپنے تئیں آخری پتا پھینکا، نہیں نہیں نہیں حاشر!! کبھی نہیں، میں تمہیں کسی اور کے لیے اجازت دے سکتی ہوں، مگر کائنات کے لیے! Imposible حاشر Imposible۔۔۔ تم نے بے چینی سے اِدھر اُدھر دیکھا کہ کوئی چیز تو ہو جو تم اپنے یا میرے سر پہ مار سکو! مگر بہت کچھ ہونے کے باوجود تم نہیں مار سکے، نہ خود کو، نہ مجھے۔ تم بے چارگی کی حد تک معصوم لگ رہے تھے، تمہاری آنکھوں میں آنسوؤں کی جھلک پڑنے لگی تو میرا دل چاہا کہ میں اپنے دوپٹے کے پلو سے تمہارے آنسو پونچھوں۔ مگر خواہشات کو حسرت بننے سے کون روک سکتا ہے!! تم!! میں!! کوئی بھی نہیں۔

خدا جانے کون سی لَے تھی جس پہ نیلے پردے کا رقص اب بھی جاری تھا، حاشر! کئی چیزیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں ہم سے کوئی غرض نہیں ہوتی جیسے یہ میز پہ دھرا خالی گلدان، جیسے تمہاری Book Shelf میں پڑی کتابیں، جیسے یہ نیلا پردہ! وہی ادھورا منظر۔۔۔ تب بھی تو یہ ادھورا تھا جب میں نے یہاں قدم رکھا تھا مگر کسی پل مجھے لگا تھا کہ شاید میں اسے پورا کر سکوں گی، شاید میرا ادھورا من بھی پورا ہو جائے گا۔۔۔ Leave me alone,Get out تم چلّائے تو باہر چڑیاں یکدم زور زور سے چیخنے لگیں، ایک دوسرے کو نوچنے لگیں۔۔۔ حاشر! تم نے غور کیا کہ جو پرندے انسانوں کے قریب رہتے ہیں ان کی سائیکی ہم انسانوں سے ملنے لگ جاتی ہے! کتنی مماثلت پیدا ہو جاتی ہے۔۔۔ میں نے تم پر نگاہ کی مگر تم شعوری طور پر کہیں دور تھے، کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہوئے بھی کتنی دور تھے۔

میں باہر چلی گئی تو تمہارا لمبا سانس میرے پیچھے تک آیا جو تم نے میرے نکلنے پر لیا، یک دم آزاد ہونے کی دلیل۔۔۔۔ مگر میں نے تو تمہارے اردگرد کبھی حبس نہیں کیا، یقیناً مجھے دکھ ہوا۔۔۔

سوکھے پتوں سے گزر کر مجھے احساس ہوا کہ "خزاں تو سارے میں آ بھی چکی" خزاں کا موسم شروع ہی سے مجھے بہت محبوب تھا، میں نے ہمیشہ سبز پتوں کی جگہ خشک پتوں کو چاہا، مگر! مگر یہ سب بننے کی چاہ تو کبھی نہیں رہی۔۔۔ پھر بھی!!!

میں دور سیاہ بینچ پر بیٹھ گئی۔۔۔ پیڑ کے نیچے، مگر وہاں بھی چڑیوں میں پکار پڑ گئی۔۔۔ کوئی ہے۔۔۔ کوئی اجنبی۔۔۔ ان کی پکار سن کر محسوس ہوا جیسے کوئی اجنبی ان کی مرضی کے بغیر ان کے گھر میں گھس آیا ہے۔ مجھے شدت سے لامکانی کا احساس تڑپانے لگا۔۔۔ حاشر! تمہیں تنہائی کی ضرورت تھی، تم نے مجھے کمرے سے نکال دیا، ایک فضول شے سی سزا۔ چڑیوں کو تنہائی چاہیے وہ مجھے چمن بدر کر دینا چاہتی ہی۔۔ خشک پتوں سی سزا۔۔۔ حاشر! میرا دائرہ کون سا ہے؟؟ میں ہر دائرے میں Un-Fitt ہوں۔

کبھی کبھی یہ زمین کتنی چھوٹی سی لگتی ہے کہ سانس کو بھی ناکافی، میرے اندر باہر آنسوؤں کا اتنا بوجھ ہے کہ بڑے بڑے درخت بھی دھبہ سے لگتے ہیں۔ میں چلتی چلتی باہر نکل گئی، کہ اجنبی لوگوں کو جب کوئی قبول نہیں کرتا تو راستے انہیں قبول کرتے ہیں، برداشت کرتے ہیں۔ کاش! ہم راستے ہوتے۔ چلتے چلتے شب ڈھلنے لگی کہ اسے ڈھلنا ہی تھا۔ جیسے بھبھوت تو بے ٹھکانہ ہے۔ بے آبرو ہے کبھی بھی رک سکتی ہے کہیں بھی۔

حاشر! میں تو جلدی جلدی تھک جایا کرتی تھی مگر احساسات کہیں پیچھے رہ گئے تھے۔۔۔ میں بالکل نہیں تھکی، شاید!! میرا سفر اس کرہ ارض پر نہیں تھا، کہیں دور تھا۔۔۔ اس دن تم نے مجھے اس قدر شکستہ کیا کہ شکستگی میری روح میں در آئی کہ جس کا تصور بھی سوہانِ روح رہا، کوہِ گراں محسوس ہوا۔۔۔ میرے ساتھ ہمیشہ یہی تو رہا کہ میں بری طرح ٹوٹ پھوٹ گئی۔۔۔ اب تو کرچیاں مجھے ہی چبھنے لگی ہیں، حاشر! وہ راستہ کانٹوں سے بھر گیا ہے جو میں نے محبت کے گلابوں سے سینچا تھا۔ حاشر! تم سچ مچ حاشر ہو، تم نے میری چھوٹی سی زندگی میں ایسا حشر اٹھایا ہے جو میں کبھی فراموش نہیں کر سکوں گی۔۔۔ بہت سے بادل مل کر گرجے تو احساس ہوا کہ میں تو بہت دور چلی آئی۔۔۔ تم سے، گھر سے، چڑیوں سے۔۔۔ مگر حاشر! تم سے تو میں اس دن ہی دور چلی گئی تھی جس دن تم نے پہلی بار کائنات کے لیے بات کی تھی۔

تم کیا جانو! یہ تو میرے ٹوٹ جانے کا قصہ ہے،

یہ تو ان دنوں کی بات ہے جب میرے اندر بغاوت ہو گئی تھی۔۔۔ پہل کس نے کی تھی، مجھے اس سے کبھی غرض نہیں رہی۔۔۔ جب سارے باغی کوچ کر گئے تو میرا من سونا پڑ گیا اور پھر سونے بن میں کون قدم دھرتا! تم بھی نہیں۔۔۔ سنا ہے سنسان راستوں پر پڑنے سے پہلے مائیں بازو کھینچ لیا کرتی ہیں کہ "دکھ گھات لگائے بیٹھا ہے" مجھے ہمیشہ دیر ہو گئی، آخری قطار کے سب سے آخری فرد کو سب سے کم ملتا ہے اور اگر کبھی پہلے پہنچ بھی جاؤں تو خدا ترسی مار دیتی ہے۔۔۔ تم تو جانتے ہو کہ ہوا جب چاروں جانب سے یورشیں کرنے لگے تو مٹی کو کوچ کرنا ہی پڑتا ہے، مگر تم کو کیا پتہ کہ کوچ کا دکھ کیا ہے! تمہیں کبھی کوچ نہیں کرنا پڑا، کوچ کے لیے میں جو ہوں، وہ کمرہ ہو یا گوشہءچمن، تم تو یہ بھی نہ جان سکے کہ درمیانی کیفیت کیا ہے! تم کبھی اس کیفیت سے نہیں گزرے۔۔۔ مگر کچھ "بے جان" ایسے بھی ہوتے ہیں جو مستقل درمیانی کیفیت میں رہتے ہیں، ان کے پاس صرف سوچ ہوا کرتی ہے کہ وہ کمرے سے نکل کر کہاں جائیں؟ باغ میں! یا انجانی راہوں کے سپرد ہو جائیں۔۔۔ اور حاشر! کبھی کبھی تو سوچ بھی کھو جاتی ہے خوشبوؤں کی طرح، خوشیوں کی طرح۔۔۔

کاش! تم کسی اور کی بات کرتے تو میں خود جاتی دامن پسار کے، مگر کائنات!! جو میری سب سے اچھی دوست ہوا کرتی تھی، میری ہر آہ سے واقف تھی، وہ تو یہ بھی جانتی تھی کہ میں اپنے کلاس فیلو کو اماں سے ملوانے والی تھی۔۔۔ مگر اس نے جھٹ سے اپنے کزن کا رشتہ اماں کے سامنے رکھا، اس پہ دلیل یہ کہ وہ مجھے پسند کرتی ہے۔

حاشر! کیا اپنی پسند کے لوگوں کے ساتھ ایسے پیش آیا جاتا ہے، جیسے کائنات نے کیا! اور پھر مشرق کی لڑکیاں کہاں انکار کیا کرتی ہیں۔

جیسے کبھی کبھی سورج کتنا بے بس لگتا ہے! ایسے ہی میں دلہن بن کر تمہارے آنگن میں اتر گئی۔۔۔ یہ وہ لمحات ہوتے ہیں جب کئی دامن بھرتے ہیں اور کئی خالی رہ جاتے ہیں۔۔۔ میں بارش کی طرح تمہارے آنگن میں برس گئی کہ بارش کو تو جہاں حکم ہوتا ہے وہاں برس پڑتی ہے، پوری شدت کے ساتھ۔

حاشر! میرے لیے تو نیگ لینے کی رسم بھی کتنی منحوس ثابت ہوئی، کائنات کتنی دیر تمہارے سامنے ہاتھ پھیلائے ضد کرتی رہی "کہ وہ زیادہ لے گی" کتنا چہک رہی تھی وہ اس دن۔ تمہیں، مجھے اور کائنات کو پتہ بھی نہ چلا کہ محبت کب آن پہنچی، اور تم دونوں کی آنکھوں میں مہر لگا گئی، اور میری آنکھیں خالی رہ گئیں کہ فقط بینائی بھٹکتی رہ گئی۔۔۔ تم بہت دیر کائنات کے ہاتھ سے کھیلتے رہے، اپنے ہاتھوں میں لے کر۔۔۔ اور پھر جب تم نے اس کی ہتھیلی پہ نیگ رکھا تو یوں لگا جیسے تم نے اپنی آنکھیں، دل، باقی زندگی، سب کچھ اس کی سفید ہتھیلی پر دان دیا اور میں دیکھتی رہ گئی۔۔۔ اگر تم اس کو جلدی فارغ کر دیتے تو وہ یوں میرا حصہ نہ لے جاتی اور یوں میرا سب کچھ آنے سے پہلے رخصت ہو گیا۔۔۔۔ میں نے درگزر کر دیا۔۔۔ مگر میں نے یہ شدت سے محسوس کیا کہ محبت کو "سفید چھڑی" کی ضرورت ہے، شدت سے، خیر اس کے بعد میں کائنات سے کبھی نہیں مل سکی۔

بادلوں کی گرج چمک کے ساتھ مینہ برسنے لگا تو نہ جانے کیوں مجھے تمہارے گلے میں اٹکا آنسوؤں کا گولا یاد آنے لگا۔۔۔ مجھے لگا تم رو رہے ہو، اور تمہارے آنسو میری کمزوری ٹھہرے، میں نے واپسی کا سفر شروع کیا، واپس میں جلدی پہنچ گئی مگر جاتے ہوئے خدا جانے دن کیسے ڈھل گیا۔۔۔ تم بالکونی میں کرسی پہ بیٹھے غیر مرئی نقطے پر نظریں جمائے اداس تھے۔۔۔ موسم تمہارے ساتھ برس رہا تھا، تمہاری آنکھوں کو دیکھ کر میرا فیصلہ ہچکولے لینے لگا مگر میں نے فوراً سر جھٹک دیا، تمہارے قریب آئی اور اجازت دے دی تم نے حیران ہو کر مجھے دیکھا کہ مجھے کیا ہو گیا ہے! اور میں سوچ رہی تھی کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے! شاید ہم دونوں کو ہی کچھ ہو گیا تھا کہ دونوں اپنے اپنے مدار سے ہٹ گئے تھے۔۔۔ یہ وقت جو مجھ پہ آیا تو کائنات نے مجھ پہ ترس نہیں کھایا کہ "سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا، تم فکر نہ کرو، حاشر کے ساتھ تم زیادہ خوش رہو گی"۔۔۔ مگر ایسا نہیں ہو سکا مگر آج وقت کائنات پر پڑا تو میں نے اسے بچا لیا، صرف تمہاری وجہ سے، کہ تم پہ تو سب کچھ قربان ہو سکتا ہے، تمہاری آنکھیں میرے فیصلے ہلا دیتی ہیں تمہارے آنسو میرے فیصلے بدل دیتے ہیں، اپنا سب کچھ میں نے تمہاری سمندر آنکھوں پہ دان دیا، تمہاری خوشی پہ میں نے اپنے سب حقوق چھوڑ دیے۔۔۔

اس رات تمہارے کمرے سے ایک ہی غزل کی گونج پڑتی رہی "میں ہوش میں تھا تو پھر اس پہ مر گیا کیسے" ہم روتے رہے، جدا جدا۔۔۔ اس غزل نے تو اور بھی توڑ دیا کہ آئندہ کی کوئی رات سو کے نہ گزر سکی۔۔۔ ان دنوں شدت سے مجھ میں زندگی تڑپتی رہی۔۔۔ اور پھر ایک رات میں زندگی کا رشتہ پھیکا سا پڑ گیا، الفاظ جو نشتر بن کر اترتے رہے تھے، بے ضرر لگنے لگے۔۔۔ میں نے تمہیں اسی رات معاف کر دیا، کہ تمہارا بھی کیا دوش! کون! کب! کہاں! پکڑا جائے، چیخ نہ سکے چلا نہ سکے کہ "اے عشق ہمیں برباد نہ کر" کچھ نہیں کہہ سکتے کہ احتجاج تو کہیں بہت پیچھے رہ جاتا ہے۔۔۔ آرزوؤں کے ساتھ حاشر! وہ سب چیزیں کہاں دیکھ سکتی ہیں جن کو آنکھیں ہی عطا نہیں ہوتیں، محبت کی طرح۔۔۔ لیکن حاشر! تمہاری آنکھیں بھی تو غائب ہو گئی تھیں۔۔۔ میری زندگی کے آخر میں تم بھی تو دیکھنے سے قاصر ہو گئے تھے!

یوں میری زندگی کی دوسری بھاری رات بھی ٹل گئی۔۔۔ سحر نمودار ہوئی تو چڑیوں کو بھی چہکنے کا موقع مل گیا، سانس تھا کہ دھکنی! سمجھ ہی نہ پڑی۔۔۔ خود کو سنبھالا اور تمہارے نام کی انگوٹھی کائنات کی انگلی میں ڈال دی۔۔۔ میری محبت بین کر رہی تھی۔۔۔ مگر! محبت ہے بھی تو اسی کام کے لیے۔۔۔ اس روز میں نے تمہارے چہرے پر خوشی بہت ڈھونڈی مگر بہت کچھ نہیں ملتا، کھو جاتا ہے جیسے تمہارے چہرے کی خوشی! مجھے نظر نہ آئی تو مجھے سچ مچ بہت دکھ ہوا۔۔۔ عجیب واردات محبت تھی کہ پکار بھی نہ پڑی اور لے اڑی سب کچھ۔۔۔ میں نے چاہا کہ تم سے پوچھوں کہ تم خوش کیوں نہیں ہو؟ مگر پوچھ نہ سکی کیونکہ خوش فہمیوں کا بوجھ زیادہ تھکا دینے والا ہوتا ہے۔۔۔ میں نے ہر

رسم میں تمہارا ساتھ دیا، شکست خوردگی کا احساس دبائے رکھا۔۔۔ کائنات تمہارے آنگن میں آ گئی، میں نے سب کچھ کیا، مگر کائنات کو چھوڑنے تمہارے کمرے میں نہ جا سکی، تم اپنے کمرے میں جانے کو میرے قریب سے گزرے تو تم نے میری طرف یوں دیکھا جیسے مجھے مبارک دینا تھی، جسے میں بھول رہی ہوں۔۔۔ میں نے خود کو، تم کو یا شاید دونوں کو جلانے کے لیے مبارک دی، تم نے بہ مشکل شکریہ کہا تو مجھے لگا ابھی بارش شروع ہو جائے گی۔۔۔ میرے تپتے دل پر چند بوندیں ٹپکیں گی اور میرا دل جل جائے گا۔۔۔ تم مجھے چند دن پہلے جیسے اجنبی نہ لگے۔۔۔

تمہارے کمرے کا نیلا پردہ ہل رہا ہے مخصوص لئے پر۔۔۔ ادھورا منظر بھی پورا لگ رہا ہے، چڑیاں خوشی کے گیت گا رہی ہیں۔

میرے قدم باغ کی طرف اٹھے تو لوٹ آئے کہ چڑیاں چیخ نہ اٹھیں، جاؤ، جاؤ، جاؤ، دخل اندازی تو کسی کو بھی پسند نہیں، مگر میں! میں اپنی نا آسودہ آرزوؤں کی گود میں سر رکھے بالکونی میں پڑی کرسی پر جا بیٹھی۔۔۔ مگر افسوس موسم نے میرا ساتھ نہیں دیا۔۔۔ تمہاری تو ہر کیفیت پہ موسم بدل جایا کرتے تھے۔۔۔ دو چڑیاں لڑ رہی ہیں، شاید ایک نے دوسری کے گھر پر قبضہ کرنا چاہا ہے، مگر میں ان پتوں کو دیکھ رہی ہوں جنہیں کوئی قبول نہیں کر رہا، بے اماں اِدھر اُدھر بھاگتے پھر رہے ہیں کہ کہیں اماں ملے، اور دھوپ چیخ چیخ کر کہہ رہی ہے جھوٹ، جھوٹ، جھوٹ۔ پھر خدا جانے میرے کتنے دن اسی کرسی پر بیتنے لگے۔

بس حاشر مجھے چلے جانا چاہیے، بہت دور، میرا اعتماد محبت کے اندھی ہونے پر پختہ ہو گیا ہے، میں نے کہا ناں پرندوں اور انسانوں کی سائیکی مل جایا کرتی ہے، حاشر! شاید مجھے کبھی محبت راس نہ آئے، میں چلی جاؤں گی وہاں جہاں مینہ نہ برسے، کبھی برسے گا تو سمجھ جاؤں گی کہ تم نے مجھے یاد کیا ہے اور مجھے یاد کر کے روئے ہو۔۔۔ کہ موسم بھی حاشر ہے اور تم بھی۔۔۔ مجھے معاف کر دینا کہ شاید مجھے برداشت کر لینا چاہیے تھا۔ میں تمہیں اور کائنات کو معاف کرتی ہوں۔۔۔ اور محبت کو بھی جو اندھی ہے، اور اس کا قصور بھی اندھا ہوتا ہے۔۔۔ گو کہ جانے کا احساس میری روح کو بری طرح کریدے جا رہا ہے۔۔۔ مگر سب کو جانا ہے۔۔۔ نظر مت آنا کہ آنکھیں زنجیر ہوا کرتی ہیں۔

آخری بار تمہاری/روحا

روحا نے خط کی تہہ لگا کر ارد گرد نگاہ کی، کس کو دوں! کس شاخ پہ ڈالوں! کہ تم تک پہنچ بھی جائے اور نہیں بھی، کہ بات تذبذب میں اٹکی۔۔۔ مجھے الجھن سی ہونے لگی۔۔۔ عجیب بے چینی کے عالم میں اس نے خط کو دیکھا اور آسمان پہ نگاہ کی، کہ دھوپ غائب ہو چکی تھی اور آسمان سرمئی رنگ ہو چکا تھا، اس کی بے چینی میں اضافہ ہو چکا تھا، اسے سمجھ ہی نہ پڑی تو اس نے خط کے بے شمار ٹکڑے اچھال کر کے ہوا کے سپرد کر دیے۔۔۔ حاشر اداس تھا! کائنات کے ہوتے ہوئے! چڑیوں نے شور مچانا شروع کر دیا، روحا نے ان کو دیکھا تو اسے لگا جیسے وہ اس کے ارادے سے باخبر ہو گئی ہوں اور اسے روک رہی ہوں۔۔۔ شاید اس کی آنکھ سے آنسو گرا۔۔۔ یا شاید آسمان سے حاشر کا آنسو گرا، کہ اس کی آنکھوں کی معصومیت آخری حد تک سرخ ہو چکی تھی۔۔۔ روحا کا رنگ پھیکا پڑ گیا اس کے چہرے پر نیلے پردے کا عکس لہرا گیا۔۔۔ وہ اٹھی اور بھاگتے بھاگتے گیٹ کراس کر گئی۔

بارش ہونے کو تھی، حاشر رونے کو تھا! وہ اس سے پہلے دور نکل جانا چاہتی تھی۔۔۔ وہ کمزور نہیں پڑنا چاہتی تھی، ایکا ایکی بادل گرجا، بجلی چمکی تو جیسے آسمان پھٹ گیا اور ڈھیروں پانی برس پڑا۔۔۔ اور روحا کی رفتار تیز ہو گئی۔۔۔ نہیں حاشر نہیں، وہ چیخی چلائی اور بھاگتی رہی اس سے قطع نظر کہ سامنے سے آتی گاڑی کی ہیڈ لائٹس اسے کئی بار وارن کر چکی ہیں۔۔۔ ننگے پاؤں، کھلے سر "یہ زہر میرے لہو میں اتر گیا کیسے" کی صدا اس کے پیچھے تک بھاگتی چلی گئی۔۔۔۔۔

نظم/فائزہ صابری نوا

لوگ بھی ہیں سامان بھی ہے
ٹرین کھڑی ہے گھنٹوں سے
اور چلنے کا امکان بھی ہے
دیکھ رہی ہوں کھڑی ہوئی ہے
ہلتی نا ہیں چلتی نا ہیں
دیکھ رہی ہوں۔۔۔۔
صبح ہوئی پھر رات ہوئی ہے
لوگ وہ سارے کہاں گئے!
جو ساتھ میں تھے
عورتیں تھیں کچھ مرد بھی تھے
سب کہاں گئے؟
سامان بھی سب کا ساتھ میں تھا
سب کہاں گیا!
گر چلا گیا سامان بھی
کیوں میرا ہے سامان پڑا؟؟؟
کہاں گئی سب گہما گہمی!
کہاں گئے وہ سارے لوگ!
چلتے چلتے سوچ رہی ہوں
میں تو جا کے ٹرین میں بیٹھوں
پاس گئی ہوں کھڑی رہی ہوں
چاروں جانب گھوم کے دیکھا
ٹرین نہیں ہے۔۔۔۔۔۔
ٹرین نہیں ہے گھر ہے کسی کا
ٹرین کی طرز پہ بنا ہوا ہے
ٹرین نہیں ہے۔۔۔۔۔
ہاہاہاہاہاہا
ٹرین کی پٹڑی اُدھر پڑی ہے
یعنی ٹرین اُدھر آئی تھی
گھر کے دوسری طرف جو دیکھا
ٹرین کی پٹڑی بچھی ہوئی تھی
میں نے دیکھا چلی گئی تھی
میں تنہا سامان بھی تنہا
اِک دوجے کو دیکھ رہے تھے۔

✦✦✦

چھٹکارا

روبنسن سیموئیل گل/ راولپنڈی

حاجی صاحب جس کے پاس بیٹھتے یہی مسئلہ چھیڑ دیتے۔

''بات تو آپ کی سولہ آنے ٹھیک ہے مگر بہتر ہوگا کہ کسی مولوی صاحب سے بھی رائے لے لیں۔''

''حاجی صاحب، آپ جیسے دانا اور تجربہ کار لوگوں کے کیا کہنے اور آپ کی سخاوت سے کون واقف نہیں، پھر بھی اس معاملے میں کسی مفتی صاحب سے مل لیں تو اچھا رہے گا۔ میرے خیال میں تو معاملہ بالکل صاف ہے تو بھی اتنی بڑی نیکی کرنے جا رہے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ ثواب ضائع ہو جائے۔''

غرض جتنے دوست احباب ملاقات کو آتے یا خود حاجی صاحب جن دوستوں کے درمیان بیٹھتے، ان دنوں یہ مسئلہ اُن کے سامنے رکھ دیتے۔ سبھی احباب تعریف بھی کرتے اور ساتھ کسی دینی عالم سے مشورہ لینے کا بھی کہتے۔ تاہم حاجی صاحب یہی سوچتے کہ اگر مولوی صاحب نے کوئی اور مشورہ دے دیا یا اس نیک خیال کی تردید کر دی کہ شرعی لحاظ سے اس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا تو بنا بنایا کام بگڑ جائے گا۔!

ہوا کچھ یوں تھا کہ حاجی صاحب کے بڑے بھائی گزرے برس انتقال کر گئے ۔ وہ اپنے مرحوم بھائی کے خاندان اور خصوصاً اپنی بیوہ بھابھی کے لیے فکر مند تو تھے مگر کاروباری مصروفیات کے باعث عملی طور پر کوئی مدد نہ کر سکے تھے۔ پھر اُن کے بڑے بیٹے نے بھی والد کی وفات کے بعد پڑھائی چھوڑ کر نوکری شروع کر دی تھی ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حاجی صاحب کی سفارش سے ہی ان کا بھتیجا بھرتی ہوا تھا۔ البتہ حاجی صاحب کو اس بات کا قطعاً خیال نہ آیا کہ اُن کا بھتیجا اگر اپنی ڈگری مکمل کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو اُسے اور اچھی نوکری مل سکتی تھی مگر مالی مسائل کی وجہ سے پہلے نوکری تلاش کرنا پڑی اور پھر پڑھائی کو بھی خیر باد کہنا پڑا۔

حاجی صاحب نے نوکری تلاش کرنے میں کوئی خاطر خواہ مدد نہ کی تھی۔ بھتیجے نے دربدر کی ٹھوکریں کھا کر ایک ملازمت ڈھونڈ تو لی مگر نوکری دینے والوں کو کوئی معتبر ضامن درکار تھا تو تب بھتیجے نے اپنے چچا کا حوالہ دے دیا۔

حاجی صاحب جس محفل میں بیٹھتے اپنی نیکیوں کے تذکرے کرتے ہوئے وہاں یہ بھی ضرور بتاتے تھے کہ اپنے بھائی کی وفات کے بعد انہوں نے اپنے بھتیجے کو نوکری پر لگوایا ہے۔ دوست احباب کہتے،''واہ، واہ حاجی صاحب آج کل کون کسی کو پوچھتا یا کسی کی فکر کرتا ہے... یہ تو آپ کی دریا دلی ہے۔''

اب موجودہ مسئلہ یہ تھا کہ حاجی صاحب کے پاس زکوٰۃ کی خطیر رقم مبلغ چار لاکھ روپے جمع ہو چکے تھے اور وہ سخاوت کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ رقم اپنی بیوہ بھابھی کو ہی دینا چاہتے تھے کیوں کہ وہ مستحق اور جائز حق دار بھی تھیں اور بیواؤں اور یتیموں کی کفالت کا اجر و ثواب بھی بہت ہے۔

تاہم اس سے بھی بڑا مسئلہ یہ تھا کہ حاجی صاحب کے بڑے بھائی جو گزشتہ برس اپنے خالق حقیقی کے حضور پیش ہو چکے تھے، ان کے اعمال کا حساب کتاب تو اللہ جانے اور وہ جانیں کہ جزا و سزا تو اُسی عظیم ہستی کے ہاتھ میں ہے البتہ حاجی صاحب کو یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ اُن کے بڑے بھائی کی روح کسی عذاب میں ہی نہ پھنس چکی ہو۔ وہ اُس روح کے چھٹکارے کے لیے بھی بہت زیادہ فکر مند تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اُن کی وجہ سے اُن کا بھائی اللہ تعالیٰ کی بارگاہوں میں روز محشر کو مجرم ٹھہرے۔

اب زکوٰۃ کی خطیر رقم کا بوجھ بھی اُن کے ناتواں کندھوں پر تھا۔ اسی طرح اپنی بیوہ بھابھی اور بھتیجے بھتیجیوں کی کفالت کے لیے بھی وہ کچھ کرنا چاہتے تھے مگر ان سب سے بڑھ کر بھائی کی محبت انہیں مجبور کر رہی تھی کہ اُس کی روح بھی چھٹکارا پا کر اگلی منزلیں طے کر سکے۔ اس بوجھ سے حاجی صاحب کو بھی چھٹکارے کی ضرورت تھی اور مالی بوجھوں سے اُن کی بیوہ بھابھی اور بچوں کو بھی چھٹکارا درکار تھا۔

بس ان تین اہم مسائل کے حل کے لیے حاجی صاحب کوشاں تھے اور دینی علماء، مفتیوں و مولویوں سے بھی مشورہ کرنے سے گریزاں تھے کہ یہاں ہر مولانا کی اپنی مسجد اپنا مسلک اور اپنا اپنا نظریہ ہوتا ہے۔ خواہ مخواہ اتنا بڑا مسئلہ اتنی دانائی سے حل ہوتے ہوتے بگڑ ہی نہ جائے۔

ایک روز اُن کے دیرینہ دوست اُن کی دکان پر موجود تھے جو وسیع مطالعہ اور تجربہ رکھتے تھے حاجی صاحب نے بڑی تفصیل سے اپنا مدعا اُن کے سامنے

CamScanner

پیش کیا۔ اُنہوں نے بھی بغور سنا اور دیگر دوستوں کی طرح پہلے تو حاجی صاحب کی دریا دلی، سخاوت اور عظیم سوچ پر داد دی اور پھر جاتے ہوئے کہہ گئے،

''میرے خیال میں تو ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ یہ سبھی کے لیے اور خصوصاً آپ کے بھائی کی روح کے لیے چھٹکارے کا سبب ہوگا... تو بھی کسی عالم سے مشورہ ضرور کر لیجیے گا۔''

مگر حاجی صاحب کا وہی خدشہ کہ کہیں بنی بنائی بات بگڑ نہ جائے۔ ویسے بھی کسی کام کے لیے تین گواہیاں کافی ہوتی ہیں تو یہاں تو درجنوں گواہیاں مل چکی تھیں تھیں۔

آخر اگلے ہی روز حاجی صاحب اپنے بیوی بچوں کے ہمراہ اپنے مرحوم بھائی کے گھر پہنچے تاکہ زکوٰۃ کی وہ چار لاکھ کی رقم اپنی بیوہ بھابھی کو تھما سکیں۔ اُن کا بھتیجا بھی نوکری سے واپس آ چکا تھا۔ پورے خاندان کو بٹھا کر حاجی صاحب نے تمہید باندھی۔ فون پر اپنے آنے کا عظیم مقصد تو پہلے ہی بیان کر چکے تھے۔ مرحوم بھائی کے خاندان نے خوب خاطر مدارات کیں کہ چچا جان اتنی فکر مندی سے اُن کے ہاں آئے تھے اور مالی طور پر بھی قلبی وسعت کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ چائے کے ساتھ بے شمار لوازمات کے بعد کھانے کا بھی بھرپور بندوبست کیا گیا تھا۔

مرحوم کی زندگی پر سیر حاصل گفتگو کی گئی۔ مرحوم بھائی کی بچپن کی شرارتیں، جوانی کے قصے، بیرونِ ملک ملازمت، اُن کی کامیابیاں و ناکامیاں... غرض سبھی قصے کہانیاں دل چسپ انداز میں حاجی صاحب اُن کے اہل خانہ کے سامنے پیش کرتے رہے اور اہل خانہ بھی طرح طرح کے لذیذ کھانے، پھل فروٹ میٹھے میں کسٹرڈ اور جیلی پیش کرتے رہے۔

حاجی صاحب نے وہ قصہ قہوے کے دوران چھیڑا، جب رخصت کا وقت آ پہنچا۔ حاجی صاحب نے افسردہ لہجے میں کہنا شروع کیا، ''یوں تو میرے بھائی میں بے شمار خوبیاں تھیں مگر صرف ایک ہی خامی تھی کہ اُسے قرض لینے کی عادت تھی۔ بہت بار سمجھایا بھی مگر وہ باز نہ آیا آخری دنوں میں میرے پاس آیا کہ آٹھ دس لوگوں سے ادھار پکڑے ہیں اگر چار لاکھ مل جائیں تو مَیں اِس بوجھ سے چھٹکارا پا لوں گا۔''

خاندان کے سبھی افراد بڑے غور سے حاجی صاحب کی گفتگو سن رہے تھے۔ انہوں نے سبز قہوے کی چسکی لی اور پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولے، ''مَیں تو اپنے بھائی کی روح کے لیے فکر مند ہوں۔ میں اُسے اِس دُنیا میں تو قرض خواہوں سے چھٹکارا دلا سکا۔ مگر اُس اگلے جہان کے لیے فکر مند تھا۔ تاہم اِس نیک خیال نے مجھے بڑے بوجھ سے چھٹکارا دے دیا۔ اور ہاں، میری یہ نیکی آپ لوگوں پر سے بھی بڑے بوجھ کو ہٹا دے گی اور سب سے بڑھ کر میرے مرحوم بھائی کی روح اِس بوجھ سے چھٹکارا پا لے گی۔''

بیوہ بھابھی اور بچے سوچتے رہے کہ ابھی چچا جان انہیں رقم والا لفافہ تھما دیں گے۔ مگر روانگی کا وقت آ پہنچا تو پھر چچا جان نے کھل کر اپنا دانائی والا خیال اور اُس عظیم نیکی کا ذکر کیا،

''...تو بھابھی جان اور میرے مرحوم بھائی کے پیارے بچو، مَیں نے سوچا کہ مَیں اپنی زکوٰۃ مبلغ چار لاکھ روپے آپ کو دے دُوں۔''

خیر اس خیال کا ذکر تو حاجی صاحب گزشتہ چند روز سے اپنی بھابی اور بھتیجے کے ساتھ فون پر مسلسل کر رہے تھے۔ اب جب روبرو بیٹھ کر یہی بات کہی تو بیوہ بھابھی اور یتیم بچے للچائی ہوئی نظروں سے اُن کی جیب کی جانب بھی دیکھتے تھے کہ ابھی وہ ہاتھ بڑھا کر لفافہ تھمائیں گے مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔

''لیں بھابھی جان اب ہم چلتے ہیں میری طرف سے وہ چار لاکھ آپ کے لیے ہی رکھے ہوئے تھے۔ مَیں نے نیت باندھی، وہ آپ تک پہنچ گئے۔ ہمراہ اِس لیے نہیں لایا کہ حالات اِس قدر خطرناک ہیں، خواہ مخواہ اتنی بڑی رقم کیوں لاتا جب کہ آپ نے وہ مجھے ہی لوٹانا تھی۔ سمجھیں کہ آپ نے وہ زکوٰۃ مجھ سے وصول کر لی۔ آپ کی دعاؤں کا طلب گار رہوں گا اور اُس روز اُس ہستی کی بارگاہوں میں میری اِس نیکی کا ذکر ضرور کیجیے گا۔

حاجی صاحب پھر پرنم آنکھوں کے ساتھ کہنے لگے،

''...اور مَیں اپنے مرحوم بھائی کو اب بھی نہیں بھولا۔ آج اُس کی روح کس قدر خوش و خرم ہوگی کہ چار لاکھ کے قرض کا بوجھ اُس پر سے اتر گیا۔ یقیناً اُس کی روح نے چھٹکارا پا لیا ہے۔''

بیوہ بھابی اور اُس کے بچے سب ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے۔ آخر کار حاجی صاحب نے یہ بڑی نیکی سرانجام دینے اور لذیذ کھانا نوش فرمانے کے بعد اپنے اہل خانہ سمیت گھر کی راہ لی۔

پہلی محبت

محمد شفیق پہاڑیو/ڈیرہ اسماعیل خان

حمیرہ آج تندور پر روٹی لگاتے لگاتے اپنی پرانی باتوں کو سوچ رہی تھی کہ کیسے اُسے جوانی کی دہلیز عبور کرنے سے پہلے ہی ایک اپنے سے سترہ اٹھارہ سال بڑے آدمی سے محبت ہوگئی تھی اور اس نے اسکی محبت میں اپنی زندگی تک کو داؤ پر لگا دیا تھا۔ وہ بار بار آج چھ بچوں کی ماں بننے کے بعد اس خیال کو اپنے دماغ سے جھٹکنے کی کوشش کرتی مگر اگلی ہی روٹی لگانے پر وہ خیال پھر سے اس کے دماغ میں گھس جاتا۔ اور اُسے وہ ہر منظر اپنی آنکھوں کے سامنے دوڑتا ہوا نظر آتا کہ کیسے اسے ایک بڑی عمر کے شخص سے بے انتہا محبت ہوگئی تھی۔ اور اس شخص نے کیسے حمیرہ کی کچی جوانی کو تار تار کر دیا تھا۔ مگر وہ ابتدائی جذبہ تھا کہ جس میں کسی بھی طرح کمی نہ آئی۔ اگرچہ وہ پختہ عمر شخص پہلے سے شادی شدہ اور بال بچوں کا باپ تھا مگر پھر بھی حمیرہ کو اس سے بے انتہا لگاؤ تھا۔ اور حمیرہ نے اس پہلی محبت میں کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا تھا۔ آج پختہ عمر ہونے کے باوجود بھی اس کی وہ کچی جوانی کے سارے منظر آنکھوں کے سامنے پھر رہے تھے۔ اس سوچ اور خیال میں وہ دو ایک روٹی کو تندور میں جلا بھی چکی تھی مگر یہ پہلی محبت کے خیالات ہی تھے کہ جنہوں نے اس کے دامن کو مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔ اور چھٹنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

کبھی کبھی اسے اپنے بچپن کی یہ باتیں انتہائی بری لگتیں اور اسے یوں محسوس ہوتا کہ جیسے اس نے اپنے شوہر کے ساتھ خیانت کی ہو۔ اور وہ اپنے آپ کو ایک مجرم خیال کرتے ہوئے نہ صرف اپنے اس پہلے پریمی سے بلکہ خود سے بھی نفرت کرنے لگتی مگر چند منٹوں کا یہ اُبال جلد ہی ٹھنڈا پڑ جاتا اور اسے وہ پہلی محبت ایک سریلی بانسری کا ساز معلوم ہونے لگتی جس نے حمیرہ کو اپنی گرفت میں لے کر زندگی کی کئی ابتدائی لذتوں سے آشنا کر دیا ہو۔ انہی خیالوں نے حمیرہ کو کئی بار بجلی کے جھٹکوں اور ہانڈی کے جلنے اور ہاتھوں کے کٹنے سے بھی متعارف کرا دیا تھا۔ آج تندور پر پہنچتے ہی اس ابتدائی محبت کے خیالوں نے پھر اس کا دامن پکڑ لیا اور اسے وہ سب سہانے منظر یاد آنے لگے کہ کیسے وہ ایک بڑی عمر کے شخص کی محبت کیلئے تڑپتی تھی اور راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر چھت کے راستے اس سے ملنے جاتی جہاں وہ ہوس کا پجاری آتے ہی اسکو کپڑوں کے بندھن سے آزاد کر دیتا اور اس ناپختہ عمر میں حمیرہ یہی سمجھتی کہ شاید یہی محبت کا حقیقی مقصد ہے اور اسی کی تکمیل ہی محبت ہے۔ اگرچہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حمیرہ کو اس شخص کا پیار جسم کا بیوپار لگتا رہا مگر حمیرہ اپنی شادی سے پہلے تک اپنی اس کچی اور پہلی محبت سے مکمل طور پر آزاد نہ ہو سکی اور کئی بار اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ کیا ہوا جو مجھ سے سترہ اٹھرہ سال بڑا ہے۔ ہے تو میری ہی پسند کیوں نہ اس سے شادی ہی کر لی جائے۔ مگر پھر زمانے کی لعن طعن اور رشتوں کی پابندیوں کو سوچ کر صبر کر لیتی۔ ایسے ہی گزرتے ہوئے حالات میں سخت پابندیوں کے بعد حمیرہ کی شادی اس کے والدین نے کہیں اور کر دی اور حمیرہ اپنی امنگوں اور آرزوؤں کو دبائے کسی اور گھر کی دلہن بن گئی۔ جہاں جاتے ہی حمیرہ کے اپنی پرانی اور پہلی محبت کے عکس ماند پڑ گئے اور وہ ایک نئی دنیا میں خود کو ڈھالنے کی کوشش کرنے لگی۔ آہستہ آہستہ اس کا ہم عمر شوہر بھی اسے ایک حد تک اچھا لگنے لگا اور وقت کے ساتھ ساتھ وہاں اولاد بھی ہوتی رہی جس نے ایک حد تک حمیرہ کے دل و دماغ سے اس کی پہلی محبت کے احساس کو بھی مدھم کر دیا تھا۔ اس لیے حمیرہ اب ہر وقت خوش رہتی اور اپنے بچوں کے خیالات میں گم رہتی۔ مگر کبھی کبھی اسے وہ لمحے یاد آ جاتے جب وہ اپنی جان اور عزت کی پرواہ کیے بغیر کبھی سرد راتوں کے اندھیرے میں اور کبھی صبح کی اذان کے وقت اور کبھی گرمیوں کی کڑکتی دوپہر میں اس شخص کے اشاروں پر اس سے ملنے پہنچ جایا کرتی تھی۔

اب وہ سب باتیں خواب لگتی تھیں مگر ایک بات جس نے حمیرہ کو آج تک اپنی گرفت میں لیا ہوا تھا۔ وہ یہ تھی کہ حمیرہ آج تک اپنی پہلی محبت کو بھلا نہیں سکی تھی۔ اور جب بھی موسم خوشگوار ہوتا کسی کی شادی بیاہ کے شادیانے بجتے یا کوئی محبت کی داستان بے نقاب ہوتی تو حمیرہ کو اپنا محبت بھرا سارا سفر یاد آنے لگتا۔ نہ جانے کیوں چھ بچوں کی ماں ہونے کے باوجود بھی وہ اپنی محبت کی اس پہلی کسک کو نہ بھلا سکی۔ کئی مرتبہ دل سے عہد کیا کہ اب اپنے مجازی خدا کے سوا کسی طرف بھی نہیں سوچوں گی مگر پھر نہ جانے کہاں سے وہ محبت بھری راتوں کے خیالات آتے اور حمیرہ کو اپنی جکڑ میں لے لیتے۔ ایسے ہی حالات میں ساتھی عورت نے حمیرہ کو ہلایا اور کہا کہاں کھو گئی ہو تمہیں دکھائی نہیں دیتا تندور کے اندر تمہاری روٹیاں جل رہی ہیں اور تم ہو کہ انہیں نکالتی ہی نہیں۔ حمیرہ نے کہا پتہ نہیں میں کن خیالوں میں کھو گئی تھی مگر اسے دل میں یہ احساس تھا کہ یہ پہلی محبت کی چنگاری ہے، جو شاید کبھی نہ بجھے۔

گاما پہلوان رُستمِ جہان ''گنگا کا شیر، ہندوستان کی علامت، پاکستان کا فخر''

علامہ عبدالستار عاصم/لاہور

نام کتاب: گاما پہلوان رستمِ جہان

مصنف: بلبیر سنگھ کنول

یہ کتاب سردار بلبیر سنگھ کنول کی تحریر ہے جس کا اردو ترجمہ ثناء اللہ گوندل نے کیا ہے۔ یہ دنیا کے عظیم اور ناقابلِ شکست پہلوان "گاماں پہلوان" کی زندگی پر مبنی ہے، جنہوں نے نہ صرف ہندوستان میں بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی اپنی طاقت، فنِ پہلوانی اور غیر متزلزل عزم سے شہرت حاصل کی۔ گاماں پہلوان صرف ایک کھلاڑی نہیں، بلکہ برصغیر کی جسمانی طاقت، غیرت، اور ثقافتی ورثے کی جیتی جاگتی علامت تھے۔

کتاب کا آغاز مہارانی پرنیت کور پٹیالہ کے لکھے گئے پیش لفظ سے ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف ایک سیاسی و سماجی شخصیت ہیں بلکہ برصغیر کی ثقافت، تاریخ اور روایتی فنون کی عمیق فہم بھی رکھتی ہیں۔ اُن کا اندازِ بیان جذبات سے بھرپور اور فکری لحاظ سے پختہ ہے۔ پیش لفظ میں گاماں پہلوان کی عظمت کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے اُن کی زندگی کو ایک عہد کی علامت قرار دیا گیا ہے۔ مہارانی پرنیت کور پٹیالہ نے گاماں کو صرف ایک پہلوان نہیں بلکہ ایک تہذیبی ورثہ قرار دیا ہے، جو برصغیر کے دیہی کلچر، غیرت، جسمانی تربیت و استقامت کی نمائندگی کرتا ہے۔

کتاب کے مندرجات بھی اسی جامع زاویے سے ترتیب دیے گئے ہیں۔ ابتدا میں کرشنا گو[illegible]انیا کی تحریر کردہ خراجِ تحسین شامل ہے، جو گاماں کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو نپے تلے الفاظ میں اجاگر کرتی ہے۔ تعارف میں مصنف نے اس عہد کی سیاسی و سماجی فضا کو بیان کیا ہے جس میں گاماں کی شخصیت ابھری۔ ں کے بعد مختلف ابواب میں گاماں پہلوان کی زندگی کے وہ تمام مراحل بیان کیے گئے ہیں جو ان کے سفر کو ایک لیجنڈ میں تبدیل کرتے ہیں۔

یہ کتاب صرف گاماں کی جسمانی طاقت کی کہانی نہیں بلکہ اُس روح کی داستان ہے جو ایک غلام قوم کے اندر سے اٹھ کر دنیا کے بلند ترین مقام پر جا پہنچی۔ یہ ایک ایسے شخص کا بیان ہے جو نہ صرف میدان میں ناقابلِ شکست رہا بلکہ ایک پوری تہذیب کا وقار بھی بن گیا۔

یہ محض ایک پہلوان کی سوانح عمری نہیں بلکہ ایک پورے عہد، ایک ثقافت، اور ایک ورثے کی مکمل داستان ہے۔ گاماں پہلوان کی شخصیت، ان کی فتوحات، ان کا کردار، اور ان کی عظمت صرف ایک فرد کی کامیابی کی کہانی نہیں بلکہ ہندوستان کی اجتماعی روح، اس کی غیرت، اور اس کی جسمانی و روحانی طاقت کی علامت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کی ضرورت محسوس ہوئی۔ عظیم گاماں کو صرف ہندوستان یا پاکستان کے دائرے میں دیکھنا ان کی شخصیت کی وسعت کو محدود کرنا ہوگا۔ وہ ایک عالمی پہچان رکھنے والے پہلوان تھے، جنہوں نے اُس دور میں بھی دنیا کے بڑے بڑے پہلوانوں کو شکست دی، جب ہندوستان غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ اس کتاب کے ذریعے نہ صرف گاما کی شخصیت کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے بلکہ ان کے گرد بننے والے معاشرتی، تاریخی، اور ثقافتی پس منظر کو بھی بیان کیا گیا ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے جس شخصیت کا ذکر کیا گیا ہے وہ مہاراجہ بھوپندر سنگھ ہیں، جنہوں نے گاماں پہلوان کی سرپرستی کی۔ مہاراجہ نہ صرف ریاست پٹیالہ کے حکمراں تھے بلکہ کشتی کے فن کے ایک سچے قدردان بھی تھے۔ انہوں نے گاماں کے لیے بہترین تربیت، آرام، مالی مدد، اور بین الاقوامی سطح پر مقابلوں میں شرکت کے مواقع فراہم کیے۔ مہاراجہ کی سرپرستی نہ ہوتی تو شاید گاماں کی عالمی فتوحات اتنی مؤثر نہ ہوتیں۔ مہاراجہ پٹیالہ کے دربار اور اکھاڑے گاماں جیسے عظیم سپوت کی پرورش کے لیے ایک مثالی ماحول فراہم کرتے رہے۔

اس کتاب میں ہندوستانی کشتی کی تاریخ کو بھی تحقیق و جستجو کے ساتھ شامل کیا گیا ہے۔ قدیم زمانے سے لے کر انگریزوں کے دورِ حکومت تک، کشتی محض ایک کھیل نہیں رہی بلکہ ایک روحانی، جسمانی اور تہذیبی تربیت کا ذریعہ رہی ہے۔ اکھاڑے، گاؤشالائیں، دیسی خوراک، سنتوں کی دعائیں اور استاد و شاگرد کا رشتہ، یہ سب ہندوستانی کشتی کے اہم اجزاء تھے۔ گاماں انہی روایات کے نمائندہ تھے۔ ان کی تربیت، جسمانی ساخت، طرزِ زندگی اور روحانی وابستگی ان تمام عناصر کی عملی تصویر تھی۔

بین الاقوامی سطح پر جب گاماں نے اپنے سفر کا آغاز کیا تو ان کا سامنا ایک امریکی پہلوان رولر سے ہوا۔ رولر محض ایک پہلوان نہیں بلکہ ایک ذہین اور فلسفیانہ ذہن رکھنے والا شخص تھا، جو کشتی کو جسمانی مشق کے ساتھ ساتھ دماغی برتری کی جنگ بھی سمجھتا تھا۔ گاماں نے نہ صرف جسمانی لحاظ سے اسے زیر کیا بلکہ رولر نے بعد ازاں خود اس بات کا اعتراف کیا کہ گاماں کی طاقت اور فنی مہارت نے اسے حیران کر دیا۔ رولر جیسے مغربی حریف کی گاماں کے ہاتھوں شکست گاماں کے بین الاقوامی مقام کو تسلیم کرانے کا ایک اہم سنگ میل تھی۔

اس بیانیے میں اہم کرداروں کیکر سنگھ پہلوان دیو ہند، غلام پہلوان رستم دوراں اور کلو پہلوان ستارہ ہند کا ہے، جو گاماں سے پہلے ہندوستانی کشتی کے سب سے بڑے نام سمجھے جاتے تھے۔ ان کی شہرت اور فتوحات نے برصغیر میں کشتی کو عزت بخشی۔ 1857 سے 1914 تک کا دور کیکر سنگھ دیو ہند، غلام پہلوان رستم دوراں اور کلو پہلوان ستارہ ہند کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ان کی جسمانی ساخت، دیسی خوراک کا استعمال، اور پہلوانی کے میدان میں بے مثال تربیت نے آنے والی نسلوں کو متاثر کیا، جن میں گاماں پہلوان بھی شامل تھے۔ گاماں نے کیکر سنگھ پہلوان دیو ہند، غلام پہلوان رستم دوراں، کلو پہلوان ستارہ ہند اور اپنے خاندان کے رستم شہ زوروں کی روایت کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ اسے عالمی سطح تک لے گئے۔

یوں یہ کتاب گاماں پہلوان کے گرد گھومتی ہوئی اُس پوری تہذیب کا نقشہ پیش کرتی ہے جس میں جسم محض ایک مشق کا ذریعہ نہیں بلکہ کردار کی علامت تھا۔ ہر کشتی، ہر مقابلہ، ہر فتح ایک ثقافت کی فتح تھی۔ گاماں اس تہذیب کا وارث تھا، اور یہی وجہ ہے کہ آج بھی وہ ایک لیجنڈ کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے۔

امرتسر، جو برصغیر کے دل میں بسا ایک تاریخی اور روحانی شہر ہے، کشتی کی دنیا میں بھی ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔ اس شہر کی گلیوں اور کوچوں میں صدیوں پرانی روایتوں کی بازگشت سنائی دیتی ہے، اور انہی روایتوں کا ایک نمایاں حصہ اس کے مشہور اکھاڑے ہیں۔ امرتسر کے اکھاڑے محض مشق گاہیں نہیں تھے، بلکہ وہ ادارے تھے جہاں جسم کو تراشا جاتا، کردار کو سنوارا جاتا، اور انسان کو پہلوان بنایا جاتا تھا۔

ان اکھاڑوں کی ایک خاص بات یہ تھی کہ وہاں تربیت صرف جسمانی طاقت کی حد تک محدود نہ تھی، بلکہ وہاں شاگرد کو استاد کے سامنے سر جھکانا سکھایا جاتا، صبر و تحمل کی تلقین کی جاتی، اور اپنی طاقت کو قابو میں رکھنے کا ہنر سکھایا جاتا تھا۔ ان اکھاڑوں میں صبح سویرے پہلوانوں کی للکاریں، مٹی کی خوشبو، اور دیسی گھی کی خوشبو سے لبریز خوراک کی تیاری، ایک روحانی کیفیت پیدا کرتی تھی۔

ان میں سب سے نمایاں اکھاڑوں میں ”اکھاڑا شیراں والا“ اپنی مثال آپ تھا۔ یہاں کے پہلوانوں کی شہرت صرف امرتسر تک محدود نہ تھی بلکہ یہ لوگ لاہور، پٹیالہ، دہلی، اور کلکتہ تک اپنے فن کا سکہ جما چکے تھے۔ یہاں سے تربیت پانے والے کئی نامور پہلوانوں نے بین الاقوامی دنگلوں میں اپنی طاقت کی دھاک بٹھائی۔

اسی طرح ”اکھاڑا گلاب سنگھ“ کا ذکر بھی احترام کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ یہ اکھاڑا خاص طور پر اپنی نظم و ضبط، سخت تربیت، اور اصول پسندی کے لیے جانا جاتا تھا۔ یہاں کے استاد نہایت سخت گیر تھے، لیکن ان کی تربیت سے نکلنے والے پہلوان میدان میں شیر بن کر اترتے تھے۔

امرتسر کے یہ اکھاڑے صرف جسموں کے نہیں، بلکہ ایک پوری ثقافت کے امین تھے۔ یہاں پسینہ محنت کا استعارہ تھا، اور مٹی عزت کا زیور۔ یہ اکھاڑے گاماں پہلوان جیسے دیو قامت کرداروں کے لیے بنیاد فراہم کرتے تھے، جنہوں نے نہ صرف اپنے شہروں بلکہ پوری قوم کا سر فخر سے بلند کیا۔

یوں امرتسر کے اکھاڑے اس تہذیب کے درخت کی وہ جڑیں ہیں جن سے پہلوانی کا سایہ آج بھی پھیلتا ہے۔ ان کا ذکر محض ماضی پر نوحہ نہیں، بلکہ ایک ایسے ورثے کی یاد دہانی ہے جو آج بھی ہمارے دلوں میں زندہ ہے۔

برصغیر کی دیسی کشتی کی دنیا ایک تہذیب ہے، جہاں ہر اکھاڑے، ہر پہلوان، ہر چال اور ہر اصطلاح کے پیچھے ایک تاریخ، ایک روایت اور ایک فلسفہ پوشیدہ ہے۔ اس دنیا میں ”رومالی، دلالی، پلائی“ جیسی اصطلاحات محض الفاظ نہیں بلکہ پہلوانی کے سماجی اور ثقافتی رنگوں کی جھلکیاں ہیں۔ یہ وہ الفاظ ہیں جو دیہی کشتی کے دنگلوں میں سننے کو ملتے تھے، جن کے پیچھے پہلوانوں کے لب و لہجے، ان کے دعوے، اور ان کی چالاکیاں چھپی ہوتی تھیں۔ امرتردی جیسے کردار ان روایات کو نہ صرف زندہ رکھتے تھے بلکہ ان میں رنگ بھرتے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو کشتی کے اکھاڑے کے باہر کھڑے ہو کر گاماں جیسے عظیم سپوتوں کے دنگل کو عوامی دلچسپی اور تحرک کا مرکز بناتے تھے۔

لاہور کے اکھاڑوں کا تذکرہ کیے بغیر گاماں پہلوان کی کہانی مکمل نہیں ہو سکتی۔ لاہور، جو اس دور میں برصغیر کے ثقافتی اور جسمانی تربیت کے مراکز میں شمار ہوتا تھا، وہاں کے اکھاڑے جسمانی تربیت کے گہوارے تھے۔ ان اکھاڑوں میں پہلوان صرف جسم نہیں بناتے تھے بلکہ کردار کی تعمیر کرتے تھے۔ استادوں کا احترام، شاگردی کا سلیقہ، اور صبح سویرے کی مشقت لاہور کے اکھاڑوں کی پہچان تھی۔ انہی اکھاڑوں میں گاماں نے اپنے فن کی بنیاد رکھی، پسینہ بہایا، خاک چاٹی، اور اپنی روح و بدن کو تربیت دی۔

سیالکوٹ کی زمین بھی کچھ کم زرخیز نہ تھی۔ وہاں کے شہ زور پہلوانوں نے ہمیشہ دیسی کشتی میں اپنا مقام بنایا۔

استاد انو الہ کشمیری لون خاندان کا نام خاص طور پر لیا جاتا ہے جو نہ صرف سیالکوٹ کا فخر تھے بلکہ برصغیر بھر میں ان کا رعب و دبدبہ تھا اور شہ زوری کے میدان میں انکی طاقت کا ڈنکا بجتا تھا اور پہلوانوں کے اس ممتاز خاندان کی سات نسلیں مسلسل میدان کشتی

میں منظر عام پر اکھاڑے میں اتریں۔ جن کے انداز، چال، اور روحانی تربیت کا طریقہ آج بھی دیسی کشتی کی روایتوں میں سنایا جاتا ہے۔ گاماں پہلوان جیسے عظیم کردار انہی روایات کی کوکھ سے پیدا ہوئے تھے۔

گاماں کی پیدائش ایک عام مگر باوقار گھرانے میں ہوئی۔ ان کا تعلق کشتی کے ایک عظیم روایتی گھرانے سے تھا جہاں پہلوانی ایک نسل در نسل منتقل ہونے والا فن تھا۔ بچپن سے ہی ان کی جسمانی ساخت غیر معمولی تھی، مگر اس سے بڑھ کر ان کا جذبہ اور عزم نمایاں تھے۔ ان کی اٹھان میں دیسی خوراک، اکھاڑے کی مٹی، استادوں کی دعائیں، اور قدرتی مشقت شامل تھی۔ انہوں نے جس انداز سے خود کو تربیت دی، وہ حیران کن ہے۔ نہ صرف جسمانی طاقت بلکہ ذہنی جفاکشی اور نظم وضبط ان کی شخصیت کا حصہ بن چکے تھے۔

ابتدائی بڑے مقابلے ہی نے گاماں کو باقی نوجوان پہلوانوں سے ممتاز کر دیا۔ ان کے دنگل ایک تماشہ ہوتے تھے، لیکن ان کی چالوں میں حکمت، طاقت میں ضبط، اور حملے میں غیر معمولی مہارت شامل تھی۔ جب انہوں نے اپنے پہلے مشہور دنگل جیتے، تو صرف ایک نوجوان پہلوان نہیں، بلکہ ایک نئی طاقت برصغیر میں ابھرتی ہوئی محسوس ہوئی۔

ان فتوحات نے انہیں عالمی افق کی طرف راغب کیا۔ انہوں نے صرف مقامی سطح پر اپنی عظمت کو تسلیم نہیں کرایا بلکہ بین الاقوامی سطح پر اپنی شناخت بنانے کی جستجو میں لگ گئے۔ عالمی تاج کی تلاش صرف ایک پہلوان کی خواہش نہ تھی بلکہ ایک محکوم قوم کی امید تھی۔ گاماں جب مغربی دنیا کا رخ کرتا ہے، تو وہ صرف اپنے جسم کی طاقت نہیں، بلکہ اپنی قوم کی غیرت، وقار، اور روایتوں کو ساتھ لے کر چلتا ہے۔

یہی تلاش گاماں پہلوان کو عظیم بناتی ہے، ایک ایسا کردار جو جسمانی طاقت کے ساتھ ساتھ روحانی بلندیوں کو بھی چھولیتا ہے۔ برصغیر کی دیسی کشتی کی دنیا ایک تہذیب ہے، جہاں ہر اکھاڑے، ہر پہلوان، ہر چال اور ہر اصطلاح کے پیچھے ایک تاریخ، ایک روایت اور ایک فلسفہ پوشیدہ ہے۔ اس دنیا میں "رومالی، دلالی، پلالی" جیسی اصطلاحات محض الفاظ نہیں بلکہ پہلوانی کے سماجی اور ثقافتی رنگوں کی جھلکیاں ہیں۔ یہ وہ الفاظ ہیں جو دیسی کشتی کے دنگلوں میں سننے کو ملتے تھے، جن کے پیچھے پہلوانوں کے لب ولہجے، ان کے دعوے، اور ان کی چالاکیاں چھپی ہوتی تھیں۔ امر تردی جیسے کردار ان روایات کو نہ صرف زندہ رکھتے تھے بلکہ ان میں رنگ بھرتے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو کشتی کے اکھاڑے کے باہر کھڑے ہو کر گاماں پہلوان جیسے عظیم سپوتوں کے دنگل کو عوامی دلچسپی اور تحرک کا مرکز بناتے تھے۔

لاہور کے اکھاڑوں کا تذکرہ کیے بغیر گاماں پہلوان کی کہانی مکمل نہیں ہو سکتی۔ لاہور، جو اس دور میں برصغیر کے ثقافتی اور جسمانی تربیت کے مراکز میں شمار ہوتا تھا، وہاں کے اکھاڑے جسمانی تربیت کے گہوارے تھے۔ ان اکھاڑوں میں پہلوان صرف جسم نہیں بناتے تھے بلکہ کردار کی تعمیر کرتے تھے۔ استادوں کا احترام، شاگردی کا سلیقہ، اور صبح سویرے کی مشقت لاہور کے اکھاڑوں کی پہچان تھی۔ انہی اکھاڑوں میں گاماں نے اپنے فن کی بنیاد رکھی، پسینہ بہایا، خاک چاٹی، اور اپنی روح وبدن کو تربیت دی۔

سیالکوٹ کی زمین بھی کچھ کم زرخیز نہ تھی۔ وہاں کے شہ زور پہلوانوں نے ہمیشہ دیسی کشتی میں اپنا مقام بنایا۔ استاد انوالہ خاندان اور پہلوانوں کے اس ممتاز خاندان کے شہ زوروں کا نام خاص طور پر بڑی عزت وتکریم سے لیا جاتا ہے جو نہ صرف سیالکوٹ کا فخر تھے بلکہ برصغیر بھر میں ان کا رعب ودبدبہ تھا۔ ان کا انداز، چال، اور تربیت کا طریقہ آج بھی دیسی کشتی کی روایتوں میں سنایا جاتا ہے۔ گاماں پہلوان جیسے عظیم کردار انہی روایات کی کوکھ سے پیدا ہوئے تھے۔

گاماں کی پیدائش ایک عام مگر باوقار گھرانے میں ہوئی۔ ان کا تعلق کشتی کے ایک روایتی گھرانے سے تھا جہاں پہلوانی ایک نسل در نسل منتقل ہونے والا فن تھا۔ بچپن سے ہی ان کی جسمانی ساخت غیر معمولی تھی، مگر اس سے بڑھ کر ان کا جذبہ اور عزم نمایاں تھے۔ ان کی اٹھان میں دیسی خوراک، اکھاڑے کی مٹی، استادوں کی دعائیں، اور قدرتی مشقت شامل تھی۔ انہوں نے جس انداز سے خود کو تربیت دی، وہ حیران کن ہے۔ نہ صرف جسمانی طاقت بلکہ ذہنی جفاکشی اور نظم وضبط ان کی شخصیت کا حصہ بن چکے تھے۔

ابتدائی بڑے مقابلے ہی نے گاماں کو باقی نوجوان پہلوانوں سے ممتاز کر دیا۔ ان کے دنگل ایک تماشہ ہوتے تھے، لیکن ان کی چالوں میں حکمت، طاقت میں ضبط، اور حملے میں غیر معمولی مہارت شامل تھی۔ جب انہوں نے اپنے پہلے مشہور دنگل جیتے، تو صرف ایک نوجوان پہلوان نہیں، بلکہ ایک نئی طاقت برصغیر میں ابھرتی ہوئی محسوس ہوئی۔

ان فتوحات نے انہیں عالمی افق کی طرف راغب کیا۔ انہوں نے صرف مقامی سطح پر اپنی عظمت کو تسلیم نہیں کرایا بلکہ بین الاقوامی سطح پر اپنی شناخت بنانے کی جستجو میں لگ گئے۔ عالمی تاج کی تلاش صرف ایک پہلوان کی خواہش نہ تھی بلکہ ایک محکوم قوم کی امید تھی۔ گاما پہلوان جب مغربی دنیا کا رخ کرتا ہے، تو وہ صرف اپنے جسم کی طاقت نہیں، بلکہ اپنی قوم

کی غیرت، وقار، اور روایتوں کو ساتھ لے کر چلتا ہے۔ یہی تلاش گاماں جی کو عظیم بناتی ہے، ایک ایسا کردار جو جسمانی طاقت کے ساتھ ساتھ روحانی بلندیوں کو بھی چھو لیتا ہے۔

گاماں پہلوان کی زندگی محض ایک پہلوان کی داستان نہیں، بلکہ ایک پورے عہد کی روح، ایک تہذیب کی گونج، اور ایک محکوم قوم کے خوابوں کی تعبیر ہے۔ ان کی شخصیت میں وہ تمام خوبیاں جمع تھیں جو ایک سچے سپاہی، ایک باوقار انسان، اور ایک عظیم لیڈر میں ہونی چاہئیں۔ ان کا سفر خاک سے اُٹھ کر فلک تک پہنچنے کا تھا، ایک ایسا سفر جسے آج بھی دیسی کشتی کے ہر چاہنے والے کے دل میں جگہ حاصل ہے۔

گاماں کی زندگی کا آغاز 22 مئی 1878 کو ریاست دتیا میں امرتسر کے ایک کشتی گیر کشمیری لون گھرانے میں ہوا۔ گاماں کے والد گرامی عزیز بخش پہلوان بھی والا ریاست دتیا کے نامی گرامی پہلوان تھے اور چچا کلی پہلوان بھی نامور پہلوان تھے۔ جسمانی طور پر مضبوط، چہرے پر گہرائی، اور آنکھوں میں ایک عجیب سا سکون لیے یہ بچہ وقت کے ساتھ ساتھ اکھاڑے کی مٹی میں پروان چڑھا۔ اُس وقت کے دیسی اکھاڑے محض ورزش کی جگہیں نہ تھیں بلکہ تربیت کے وہ ادارے تھے جہاں جسم، روح اور سیرت کو یکجا کر کے تیار کیا جاتا تھا۔

ابھی گاماں پہلوان کی عمر پانچ سال تھی کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا وہ ہیضے سے فوت ہوئے اور انکی وفات کے تین ماہ بعد امام بخش پہلوان پیدا ہوئے۔ گاماں نے اپنے والد کی مختصر زندگی میں پدری شفقت اور محبت کا کچھ تو لطف اٹھا ہی لیا تھا لیکن قدرت نے امام بخش کو اس سے بھی محروم رکھا۔ اب یہ دو یتیم بچے زندگی کی ناہموار راہوں میں بالکل تنہا اور بے سہارا تھے ان کے سفر کی کشتی ایک ایسے طوفان میں گھر چکی تھی جس سے بچ نکلنا آسان نہ تھا عزیز بخش پہلوان کی وفات کے بعد گاماں کی پرورش ان کے نانا محترم امیر بخش المشہور لون پہلوان رستم ہند گرز بند امرتسری نے اپنے ذمہ لی۔ لون پہلوان ریاست بڑودہ کے خاص پہلوان تھے۔ ریاست بڑودہ کے راجا کھانڈے راؤ فن پہلوانی میں کسی تعارف کے محتاج نہیں یہ حکمران فن پہلوانی کے اسرار و رموز سے کماحقہ واقف تھا۔ کھانڈے راؤ کی وفات کے بعد لون پہلوان ریاست دتیا میں آبسے۔ یہ یہی لون پہلوان تھے جو برصغیر کے نامور شہ زور عنایت پہلوان استادانوالہ ستارہ ہند کے دادا بزرگوار دیو دل استاد پیر بخش پہلوان استادانوالہ رستم ہند سیالکوٹی کے ساتھ دو بار ٹکرائے۔

افسوس کہ لون پہلوان بھی اچانک ایک حادثہ کا شکار ہو گئے ان کی موت ایک پرانی رنجش کے تحت واقع ہوئی جس کے مختصر حالات اس طرح ہیں کہ ایک دفعہ کسی بات پر انہوں نے ایک برہمن کو کچھ سخت سست کہہ دیا تھا اس بنا پر بات اس حد تک بڑھی کہ وہ ان سے انتقام لینے پر آمادہ ہو گیا اور ایک دن جبکہ ہندوؤں کے تہوار "دسہرہ" کا دن تھا لون پہلوان ریاست دتیا کے شاہی قلعہ کے صدر دروازے سے باہر آرہے تھے کہ برہمن نے مقابل آکر اچانک تلوار کا ایک بھرپور وار کر دیا اور تلوار لون پہلوان کے سینہ کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہوئی گزر گئی لیکن انہوں نے بڑی ہمت سے کام لیا اسی حالت میں گھر جا پہنچے، حادثہ کی تفصیل سے گھر والوں کو آگاہ کیا اور چارپائی پر گرتے ہی جان دے دی۔

لون پہلوان ریاست دتیا کے درباری پہلوان تھے اس لیے خوف کے مارے قاتل برہمن نے وہ تلوار راجا بھوانی سنگھ کے سامنے پیش کر کے اپنے جرم کا اقبال کر لیا اور جرم کی پاداش میں برہمن کو پھانسی دے دی گئی۔

لون پہلوان کی وفات کے بعد گاماں پہلوان کی نگہداشت و پرورش انکے بڑے ماموں عیدا پہلوان لون نے کی۔

گاماں کے چھوٹے ماموں بوٹا پہلوان ریاست جودھ پور کے نامی گرامی پہلوان تھے ان دنوں ریاست جودھپور میں راجا جسونت سنگھ گدی نشین تھا۔

گاماں پہلوان کی عمر اس وقت سات سال تھی تو ان کے ماموں بوٹا پہلوان نے خط لکھ کر انہیں راجا جسونت سنگھ کے پاس بلوا لیا۔ جب گاماں کو راجا کے سامنے پیش کیا گیا تو انہوں نے خوراک وغیرہ کا باقاعدہ انتظام کر کے استاد مادھو سنگھ (لڑکا استاد گلاب سنگھ کا بیٹا) کا شاگرد بنا دیا دس سال کی عمر میں راجا جسونت سنگھ نے اپنی ریاست میں ایک عظیم الشان کسرتی مقابلہ کا انعقاد کیا اس میں شرط یہ تھی کہ جو سب سے زیادہ بیٹھکیں لگائے گا جیت جائے گا۔ اس مقابلہ میں ہندوستان کے چار سو کے لگ بھگ پہلوانوں نے حصہ لیا۔ گاماں نے بھی اپنے ماموں بوٹا پہلوان سے اس میں حصہ لینے کی ضد کی۔ راجا کی موجودگی میں مقابلہ شروع ہوا اور جو پہلوان تھک جاتا وہ پیچھے ہٹ جاتا لیکن دس سالہ گاماں تھکنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ جب مقابلہ میں صرف 14 پہلوان رہ گئے تو راجہ نے مقابلہ رکوا کر گاماں کو فاتح قرار دے دیا اور سب نے اس فیصلہ کو تسلیم کیا۔ یوں گاماں دس سال کی عمر پہلا مقابلہ جیت کر ریاستی پہلوانوں میں شامل ہو گئے۔

گاماں پہلوان کو ماموں عیدا لون پہلوان کی سرپرستی میسر آئی۔ ان کے ہاتھوں میں پل کر گاماں جی نہ صرف طاقتور بنے، بلکہ نظم و ضبط، خاموشی، عاجزی

اور دھیما پن ان کی شخصیت کا خاصہ بن گیا۔

ان کی پہلی بڑی پہچان تو کسرتی مقابلہ میں بن چکی تھی جب انہوں نے ریاست جودھ پور میں منعقد ہونے والے ایک عظیم الشان مقابلے میں شریک ہونے والے چار سو پہلوانوں میں اول پوزیشن حاصل کی۔ صرف 10 سال کی عمر میں ان کی پھرتی، طاقت اور چالاکی دیکھ کر سب حیران رہ گئے۔ یہ وہ لمحہ تھا جب پہچان کی چنگاری سلگ اٹھی، اور مستقبل کے لیجنڈ کی بنیاد رکھ دی گئی۔

وقت گزرتا گیا اور گاماں ایک عظیم پہلوان بن کر ابھرا۔ ان کی کئی یادگار کشتیاں آج بھی لوگوں کے حافظے میں زندہ ہیں۔ ان میں سب سے مشہور مقابلہ ان کے دور کے مشہور پہلوان رائے بکشی پہلوان کے ساتھ تھا۔ یہ دنگل محض ایک کشتی نہیں بلکہ دو مختلف اسکول آف تھاٹ کا ٹکراؤ تھا۔ رائے بکشی نے بڑی طاقت کے ساتھ گاماں کا سامنا کیا، مگر گاماں نے نہایت حکمت، برداشت اور مہارت سے اسے شکست دی۔ اس مقابلے نے گاما کو برصغیر بھر میں مشہور کر دیا۔

ایک اور ناقابل فراموش مقابلہ جالندھر کے پہلوان کندو کے ساتھ ہوا۔ کندو پہلوان کا جسم دیو ہیکل اور انداز درشت تھا، مگر گاماں نے اس دنگل میں اپنی مہارت، پھرتی، اور ذہانت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کندو کو شکست فاش دی۔ کندو نے بعد میں خود اعتراف کیا کہ گاما کی گرفت فولادی اور چال ناقابلِ پیش گوئی تھی۔

گاماں پہلوان جی کی سب سے عظیم کشتی شاید اُس وقت ہوئی جب انہوں نے دنیا کے مشہور برطانوی پہلوان اسٹینلے زبسکو کو للکارا۔ زبسکو اس دور کا ناقابل تسخیر پہلوان سمجھا جاتا تھا، مگر گاماں نے اس کے ساتھ ہونے والی پہلی کشتی میں اُسے میدان میں گھسیٹتے ہوئے تین گھنٹے تک قابو میں رکھا۔ اگرچہ یہ کشتی برابر رہی، لیکن گاما کی طاقت اور ثابت قدمی نے دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ بعد ازاں دوبارہ ہونے والی کشتی میں گاما نے صرف چند منٹوں میں زبسکو کو زمین پر پٹخ دیا اور فیصلہ کن فتح حاصل کی۔ یہ ایک ایسا لمحہ تھا جب ایک غلام قوم کے بیٹے نے دنیا کے طاقتور ترین ملک کے نمائندہ پہلوان کو شکست دے کر عالمی پہچان حاصل کی۔ اس فتح نے برصغیر کے لوگوں کے دلوں میں آزادی اور وقار کا نیا احساس جگایا۔

گاماں پہلوان جی کی زندگی کا ایک اور پہلو ان کی سادگی، روحانیت اور اخلاقیات تھیں۔ انہوں نے کبھی غرور یا تکبر کا مظاہرہ نہ کیا۔ ان کے شاگرد بتاتے ہیں کہ وہ نہایت خاموش طبیعت، صاف گو، وقت کے پابند اور اصولوں کے پکے تھے۔ ان کی خوراک سادہ تھی، لیکن خوراک کی مقدار حیران کن: روزانہ کئی لیٹر دودھ، ڈیڑھ سیر بادام، اور دیسی گھی سے بھرپور غذا۔ ان کا ورزش کا معمول عام انسان کے لیے ناقابلِ تصور تھا۔ وہ روزانہ پانچ ہزار سے زائد ڈنڈ، اور سات ہزار کے قریب بیٹھکیں لگایا کرتے تھے۔ یہی سخت مشق ان کی طاقت کی بنیاد تھی۔

قیام پاکستان کے بعد گاماں جی نے لاہور کو اپنا مستقل مسکن بنایا۔ انہوں نے یہاں بھی اکھاڑوں کو زندہ رکھا، نوجوانوں کی تربیت کی، اور اپنی زندگی کو کشتی کی خدمت کے لیے وقف کیے رکھا۔ وہ اپنے آخری وقت تک اس کھیل سے جڑے رہے جس نے انہیں عظمت عطا کی تھی۔ 23 مئی 1960 بروز پیر (سوموار) لاہور میں وہ اس دنیا فانی سے رخصت ہو گئے، لیکن ان کی شخصیت، ان کی فتوحات، اور ان کا کردار آج بھی زندہ ہے۔

گاما پہلوان کی زندگی ایک ایسا سبق ہے جو ہمیں بتاتی ہے کہ اگر جذبہ ہو، محنت سچی ہو، اور نیت صاف ہو تو غلامی کی زنجیریں بھی کامیابی کی راہ نہیں روک سکتیں۔ وہ نہ صرف ایک پہلوان تھے بلکہ برصغیر کی غیرت، عزم اور طاقت کی مجسم علامت تھے۔ ان کی یادگار کشتیاں آج بھی نوجوان پہلوانوں کو جذبہ، جستجو اور جرات کا پیغام دیتی ہیں۔ گاما پہلوان مر کر بھی زندہ ہیں، ایک روایت کی صورت، ایک خواب کی صورت، اور ایک مثال کی صورت۔

اس کتاب میں برصغیر پاک و ہند کے پہلوانوں کی نادر و نایاب تصاویر بھی شامل ہیں فن پہلوانی اور خاص کر گاما پہلوان کے مداحوں کے لیے ایک نایاب تحفہ ہے جس کی اشاعت کا اہتمام قلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل نے نہایت دیدہ زیب انداز میں کیا ہے۔

سردار بلبیر سنگھ کنول جی فن پہلوانی کے صف اول کے مضمون نگار ہی نہیں بلکہ ادیب، شاعر نامور محقق، مدرس اور مورخ بھی ہیں۔ جہاں تک تحقیق اور ریسرچ کا تعلق ہے اس میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ فن پہلوانی کی تاریخ مرتب کرنے میں انہوں نے بڑی دماغ سوزی اور عرق ریزی کی ہے جس کی مثال تاریخ عالم میں کم ہی ملتی ہے۔

اللہ کرے فن پہلوانی کے عظیم محسن سردار بلبیر سنگھ کنول جی کی یہ عظیم الشان کاوش قدردان ہاتھوں میں جائے اور نوجوان نسل دنیائے عالم کے طاقتور ترین ناقابلِ شکست انوکھے فنکار منفرد اور بے مثل شہ زور، برصغیر کے یکتائے زمانہ رستم زماں گاماں جی جن کی شہ زوری، طاقت داؤ پیچ اور لڑنت کے بلاد شرق و مغرب میں ڈنکے بج گئے کے لازوال کارناموں سے آشنا ہو سکے۔

جب تک فن پہلوانی زندہ ہے گاما پہلوان جی کا نام بھی زندہ رہے گا۔

ادبی تقریبات

مانسہرہ میں دوسری ہندکو کانفرنس کا کامیاب انعقاد

ہندکو وال بیٹھک اور جناح بیسک سکول کے اشتراک سے مانسہرہ میں دوسری ہندکو کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ ہزارہ کے نامور شعرا، ادبا اور معاشرے کے دیگر طبقوں سے تعلق رکھنے والی اہم شخصیات اور طلبہ کی بھر پور شرکت دیکھنے میں آئی۔۔۔ معروف شاعر و ادیب سلطان سکون نے اس کانفرنس کی صدارت کی جبکہ مایہ ناز ماہر تعلیم اور عمدہ شاعر و ادیب واحد سراج اور پی ٹی وی پشاور کے معروف اینکر پروفیسر ملک ارشد حسین مہمانان خصوصی کے طور پر شریک محفل تھے۔۔

یہ کانفرنس 12 جولائی دن گیارہ بجے سے لیکر شام 7 بجے تک رہی جس کے مختلف ادوار تھے۔

پہلے دور میں کانفرنس کے اغراض و مقاصد کے حوالے سے پروفیسر ناصر داود ملک نے ''ہندکو زبان و ادب: آج اور کل'' کے عنوان پر تحریک پیش کی اور سیدہ رخشندہ سرتاج اور سیدہ حمیرا شہزادی نے پر مغز مقالات پیش کئے۔

جناب واحد سراج اور ارشد ملک نے کانفرنس کے حوالے سے اپنا اپنا نکتہ نظر بہت عمدہ انداز میں پیش کیا اور ہندکو زبان اادب کی پرداخت کیلئے ایسی کانفرسوں کے انعقاد کو ایک مستحسن کاوش سے تعبیر کیا۔ یہ دور تقریبا ایک بجے تک رہا جس کے اختتام پر دوپہر کے کھانے کا اہتمام کیا گیا۔۔

دوسرے دور میں معروف لوک فنکار شکیل اعوان نے اپنی خوبصورت آواز میں مقامی شعرا کا کلام اور دیگر ہندکو گیت سنا کر محفل کو رونق بخشی۔

تیسرا دور گروپ ڈسکشن پر مشتمل تھا۔ پینل پر پروفیسر وحید قریشی کی صدارت میں قاضی ناصر بخت یار خان، پروفیسر رستم علی، سید مہتاب شاہ اور میڈم رفیعہ جدون موجود تھے۔ جنہوں نے ہندکو زبان و ادب کے مختلف پہلوؤں پر تفصیلی گفتگو کی۔۔

کانفرنس کا چوتھا اور آخری دور ہندکو مشاعرے پر مشتمل تھا جس کی صدارت پروفیسر محمد فرید نے کی جبکہ ہندکو اور اردو کے معروف شاعر، ادیب عبدالوحید بسمل اور رستم نامی مہمانان خصوصی کے طور پر شامل تھے۔۔ ہزارہ کے بہت سے نو آموز اور متعدد نامی گرامی شعرا نے اپنا کلام سنا کر خوب داد سمیٹی۔

کانفرنس کے منتظمین جن میں جناح بیسک سکول کے کرتا دھرتا جناب فیاض خان، فاریض خان اور ہندکو وال کے منتظم ڈاکٹر عادل سعید قریشی شامل تھے نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور اگلی کانفرنس کو اس سے بھی بہتر انداز میں ترتیب دے کر منعقد کرانے کا عندیہ دیا۔۔ یہ کانفرنس اپنی نوعیت کی ایک عمدہ ادبی کاوش تھی۔۔

توقیر احمد شریفی کی نظموں پر مشتمل کتاب ''یکسوئی'' کی تقریب رونمائی

سی ٹی این، ماورا اور حلقہ توقیرِ ادب کے زیرِ اہتمام ممتاز شاعر توقیر احمد شریفی کی نظموں پر مشتمل کتاب ''یکسوئی'' کی تقریب رونمائی گزشتہ شام گلبرگ لاہور میں منعقد ہوئی جس میں شعراء و ادباء کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔ سی ٹی این کا خوبصورت ہال دبستانِ لاہور کی معروف ہستیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا سبھی توقیر بھائی کی محبت میں تشریف لائے تھے۔ اس خوبصورت تقریب کی صدارت ملکِ پاکستان کے نامور شاعر جناب خالد شریف نے کی جبکہ مہمانِ خصوصی جناب غلام حسین ساجد تھے۔ تقریب کی نظامت بھائی دانش عزیز نے کمال خوبصورتی سے کی اللہ پاک انہیں صحتِ کاملہ عطا فرمائے آمین۔ تلاوتِ قرآنِ مجید کے بعد اظہارِ خیال کا سلسلہ شروع ہوا اکرم سحر فارانی، یوسف شاہد، ہاشم احمد (فرزند توقیر احمد شریفی) نوید صادق، شاہد اشرف اور دیگر احباب نے اظہارِ خیال کیا اور توقیر بھائی کے فن اور شخصیت کے حوالے سے خوبصورت گفتگو کی۔ نامور گلوکار اور ہمارے بھائی عدیل برکی نے توقیر بھائی کی لکھی نعت مبارکہ یا نبی یا نبی بہت ہی خوبصورتی سے پڑھی اور حاضرینِ محفل سے خوب داد سمیٹی۔ ڈاکٹر معید صاحب نے توقیر بھائی کی لکھی ہوئی غزل کو ترنم سے پیش کیا جسے سننے والوں نے خوب پسند کیا۔ اس تقریب رونمائی میں توقیر شریفی صاحب کے اہلِ خانہ کثیر تعداد میں شریک ہوئے۔ یہ بات لائقِ حسین کے ہے اس تقریب رونمائی میں احباب کثیر تعداد میں شریک ہوئے اور یہ بات جناب توقیر شریفی کی محبتوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ تقریب کے اختتام پر دعا منتہیٰ پبلی کیشنز کی جانب سے جناب توقیر احمد شریفی صاحب کو اعزازی شیلڈ پیش کی گئی۔ اختتام پر حاضرین محفل کی تواضع ہائی ٹی سے کی گئی۔ بلاشبہ یہ ایک یادگار تقریب تھی۔

ہراول انٹرنیشنل کا پہلا جشنِ لندن عالمی مشاعرہ

ہراول انٹرنیشنل نے 24 اگست 2025 کو لندن کے دریائے ٹیمز کے کنارے واقع چرچ آف سائنٹالوجی کے جدید اور پرشکوہ ہال میں اپنا پہلا جشنِ لندن عالمی مشاعرہ منعقد کیا۔ اس تقریب کی صدارت ممتاز شاعر اور محقق ڈاکٹر خورشید رضوی نے کی جبکہ

مہمانانِ خصوصی میں ڈاکٹر سعادت سعید، ڈاکٹر نثار ترابی اور امریکہ سے تشریف لائی ہوئی شاعرہ ریحانہ قمر شامل تھیں۔

مشاعرے کا آغاز تنظیم کے بانی اور معروف شاعر علی ارمان کی خوش آمدیدی گفتگو اور چرچ کی کمیونٹی افیرز ڈائریکٹر ٹریسی کولمین کے تعارفی کلمات سے ہوا۔ نظامت کی ذمہ داری نوٹنگھم سے آئی ہوئی شاعرہ زینب بخاری نے انجام دی۔

نوجوان شعرا حسن علی، مزمل عباس شجر اور رابی صفدر نے مشاعرے کی ابتدا معیاری کلام سے کی جسے خوب داد ملی۔ اس کے بعد منان قدیر، سرفراز تبسم، امین کنجاہی، ڈاکٹر عاصم خورشید، ڈاکٹر ثاقب ندیم، غافر شہزاد اور ارشد لطیف نے مشاعرے کو جلا بخشی۔ طویل عرصے بعد افتخار قیصر کی شمولیت بھی محفل کا خاص پہلو تھی۔

خواتین شاعرات میں زینب بخاری، راحت زاہد، گلناز کوثر، سیدہ کوثر اور نجمہ عثمان نے بھرپور تخلیقی اظہار کیا۔ مشاعرے کے مہمانانِ خاص ڈاکٹر نثار ترابی، ڈاکٹر سعادت سعید اور محترمہ ریحانہ قمر کے کلام نے تقریب کو وقار اور گہرائی بخشی۔

اختتام پر صدرِ مشاعرہ ڈاکٹر خورشید رضوی نے کلام سنایا تو تمام حاضرین نے والہانہ انداز میں ان کا استقبال کیا۔ تقریب کے بعد شرکاء کی چائے اور لذیذ کھانوں سے تواضع کی گئی اور یہ یادگار مشاعرہ لاہور کباب ہاؤس میں پرتکلف عشائیے کے ساتھ اپنے اختتام کو پہنچا۔

یہ تقریب لندن میں اردو ادب کی تاریخ کا ایک اہم اضافہ ثابت ہوئی اور ثابت کیا کہ خالص نیت اور اعلیٰ معیار کے ساتھ آج بھی مشاعرے سامعین کے دلوں کو گرما سکتے ہیں۔

دعا منتہیٰ مشاعرہ
''ہم محبت کی بات کرتے ہیں''

دعا منتہیٰ مشاعرہ: ''ہم محبت کی بات کرتے ہیں''

دعا منتہیٰ کے زیر اہتمام ''ہم محبت کی بات کرتے ہیں'' کے عنوان سے مشاعرہ 19 اگست 2025 کو دعا منتہیٰ کے ہیڈ آفس، کوئیز سینٹر کوئینز، فاطمہ جناح روڈ، نزد عابد مارکیٹ قرطبہ چوک میں منعقد ہوا۔ یہ تقریب دعا منتہیٰ پبلیکیشنز کے پیٹرن ان چیف جناب زیارت علی غوری کی سرپرستی میں منعقد کی گئی۔

تقریب کی صدارت معروف اور معتبر ادبی شخصیت شاہد خیالوی نے فرمائی۔ مشاعرے کے مہمانانِ خصوصی ادبی دنیا کے درخشندہ نام جناب احتشام حسن اور صدا حیدر تھے، جبکہ مہمانانِ اعزاز میں جناب افضل ساجد اور نعیم عباس ساجد شامل تھے۔

مشاعرے میں میزبان شعرا کرام ڈاکٹر دانش عزیز، اظہر عباس خان اور سعادت علی سعدی نے اپنے کلام سے محفل کو زینت بخشی۔ مہمان شعرا میں رانا اعجاز، عمران یوسف اور یاسر عرفات نے بھی اپنے اشعار سے محفل کو گرمائے رکھا۔

اس یادگار ادبی تقریب کو کامیاب بنانے میں تمام شعرا اور شرکاء نے بھرپور حصہ لیا۔ دعا منتہیٰ پبلیکیشنز نے تمام آنے والے معزز مہمانانِ گرامی کا شکریہ ادا کیا جنہوں نے اپنی موجودگی سے اس مشاعرے کو وقار اور رونق عطا کی۔

سیمینار

انٹرنیشنل اقبال سوسائٹی اسلام آباد چیپٹر اور پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز کے اشتراک سے ایک فکری وادبی سیمینار منعقد ہوا، جس کا موضوع ''غلامی سے بدتر ہے بے یقینی'' تھا۔

سیمینار میں معروف دانشوروں اور محققین نے شرکت کی، جن میں پروفیسر جلیل عالی، ڈاکٹر طاہر حمید تنولی اور پروفیسر ادریس آزاد شامل تھے۔ مقررین نے اپنے خطابات میں کہا کہ اقبال نے ہمیشہ یقین، خودی اور عمل پر زور دیا۔ بے یقینی نہ صرف غلامی سے زیادہ تباہ کن ہے بلکہ یہ قوموں کو زوال کی کھائی میں دھکیل دیتی ہے۔

تقریب کی نظامت اقصیٰ اشفاق صاحبہ نے انجام دی، جب کہ آغاز میں فہد بن سعید صاحب نے تلاوتِ کلامِ پاک کی۔ پروگرام میں کلامِ اقبال کی پراثر پیشکش فہد فاروقی صاحب نے کی، جسے حاضرین نے بے حد سراہا۔

یہ سیمینار جمعہ، 22 اگست 2025 کو اسلام آباد میں منعقد ہوا۔ شرکاء نے اس موقع پر کہا کہ ایسے فکری پروگرام اقبال کے پیغام کو نئی نسل تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

✧✧✧

بزم ''امروز'' انٹرنیشنل

گروپ کا خصوصی اجلاس

ستمبر میں کمالیہ میں ہوگا

خصوصی شرکت: فضل احمد فانی (کینیڈا)

شرکاء میں قیمتی تحائف اور انعامات پیش کریں گے

فاروق ندیم (اے ٹی الفا)، رانا اسرار، ملک سجاد احمد

شرکاء: لاہور، فیصل آباد، گوجرانوالہ، بہاولنگر، دیپالپور، ڈسکہ، مظفر گڑھ، علی پور، ایمن آباد، میاں چنوں، اسلام آباد اور کینیڈا سے اراکین۔

بزم امروز ادب و محبت کی پہچان

✧✧✧

تخلیقی توانائی کو تازہ رکھنے کے لیے مطالعہ کرتا ہوں

شاعر کا سماجی کردار بہت ضروری ہے

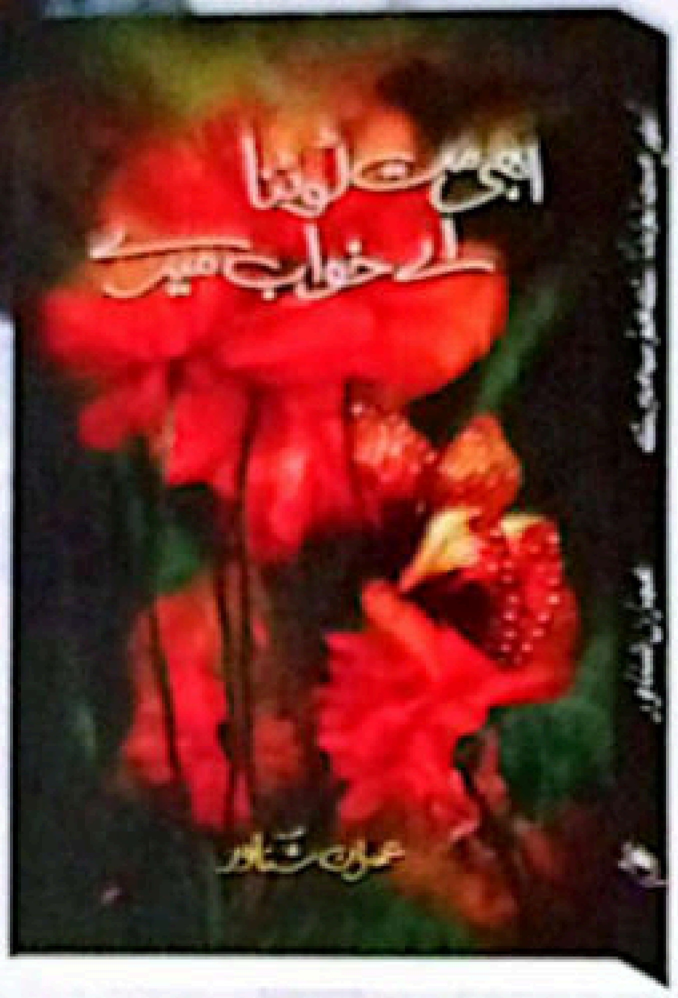

معروف اشاعتی ادارے زربفت پبلی کیشنز کے روح رواں

نوجوان شاعر، ممتاز آرٹسٹ اور صحافی

عمران شناور

سے مدیر ارژنگ حسن عباسی کا مکالمہ

آج کل کی شاعری میں مقصدیت نام کی کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ شاعری احتجاج ہے تفریح نہیں

عمران شناور بہاول پور میں پیدا ہوئے۔ بچپن یہیں گزرا، پھر چشتیاں منتقل ہو گئے۔ ڈیزائننگ اور پبلشنگ کے شعبہ سے منسلک ہیں۔ معروف ترقی پسند شاعر محترم سرور ارمان کے ساتھ مل کر اردو بازار لاہور میں زربفت پبلی کیشنز کے نام سے اشاعتی ادارہ چلا رہے ہیں۔ شاعری کی تازہ ترگنجان آبادی میں عمران شناور کی آواز بھی اُسی شور کا حصہ ہے جس میں ہر آواز اپنی انفرادیت کا نعرہ لگا رہی ہے۔ یہ نعرہ ہر اُس جدید تر شاعر کا حق ہے جو روایت کی مضبوط بنیاد پر کھڑا ہو کر اپنی شعری عمارت کی الگ الگ اینٹ رکھنے کی سعی کرتا ہے۔ عمران شناور کی معاشرتی اور ذاتی وارداتوں کے تناظر سے ابھرتی ہوئی شاعری میں بھی ایسی امتزاجی کیفیات موجود ہیں جس کے نقش و نگار گذشتہ عہد کے ماند پڑتے ہوئے رنگوں کو از سرِ نو اجاگر کر رہے ہیں۔ عمران شناور نے ۲۰۰۳ء میں شاعری شروع کی اور ۲۰۱۳ء میں شعری مجموعہ "ابھی مت ٹوٹنا اے خواب میرے" کے نام سے منظرِ عام پر آیا۔ باقی احمد پوری کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا۔ ۲۰۱۱ء میں معروف ادبی و فلاحی تنظیم 'روشن انٹرنیشنل' کی طرف سے 'روشن ایوارڈ' سے نوازا گیا۔ مختلف ٹی وی چینلز کے ادبی پروگرامز میں شرکت کی۔ بیشمار ادبی رسائل اور اخبارات میں کلام شائع ہوتا رہا۔

باقی احمد پوری صاحب کے ساتھ معاون مرتب کے طور پر بہت سے غزلوں کے انتخاب تیار کیے جو انسائیکلوپیڈیا کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کتب میں 'غزل فہمی' 'ہمارے شاعر (جلد اول)' 'ہمارے شاعر (جلد دوم)' اور 'جدید غزلیں' شامل ہیں۔ اس کے علاوہ نامور عوامی شاعر یعقوب انجم (مرحوم) کے کلام سے انتخاب "کلامِ یعقوب انجم" کے نام سے مرتب کیا جو اب نایاب ہو چکا ہے۔ معروف شاعر جناب سعد اللہ شاہ صاحب کے شہرۂ آفاق اور ضرب المثل اشعار

پر مبنی مجموعہ "سعد اللہ شاہ کی پہچان: اشعار" کے نام سے مرتب کیا۔ آیئے ان سے گفتگو کرتے ہیں:

بقیہ اندرونی صفحات پر

ثناءاللہ شاہ، ورانی نذیر، آمنہ الفت اور سعد اللہ شاہ سے "روشن ایوارڈ" وصول کرتے ہوئے

ڈاکٹر خورشید رضوی، ڈاکٹر اجمل نیازی، سرور ارمان اور باقی احمد پوری کے ہمراہ

نجم فیلوز اور بار ایسوسی ایشن کے اشتراک سے

جاپان کے بارے عامر بن علی کے انگریزی سفرنامے کی تقریب رونمائی و محفل مشاعرہ

SAKURA & SPICE : A Pakistani's Journey Through Japan

صدارت

ندیم بھابھہ

صاحب شام

عامر بن علی

مہمانان خصوصی

مہمان اعزاز

جی اے نجم

مرلی چوہان

راکب مختار

دانش نقوی

نصیر احمد

نظامت

اسد عباس اسد

پروین نقش

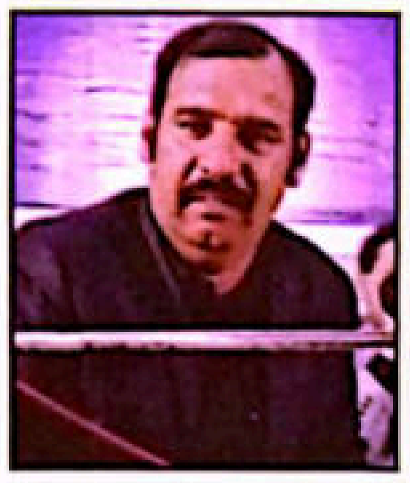

بدر سیماب

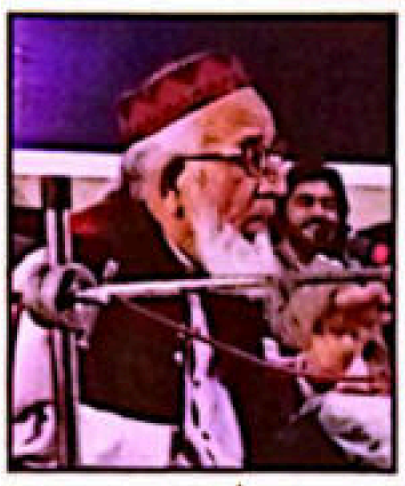

اسلم شوق

ندا فاطمہ

فاروق طراز

حنیف صوفی

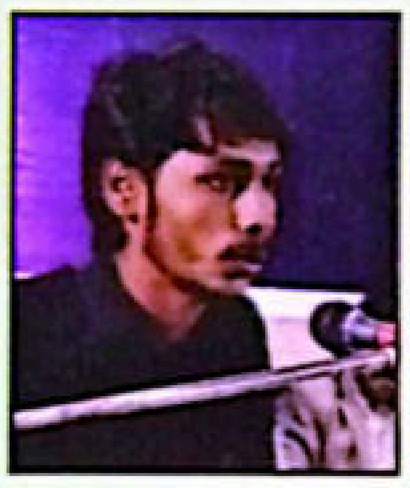

عمر عزیز

ریاض شاہد پنیاں

فخر لالہ

امجد خان تجوانہ

عدنان آصف بھٹہ

رافعہ ارم مرزا

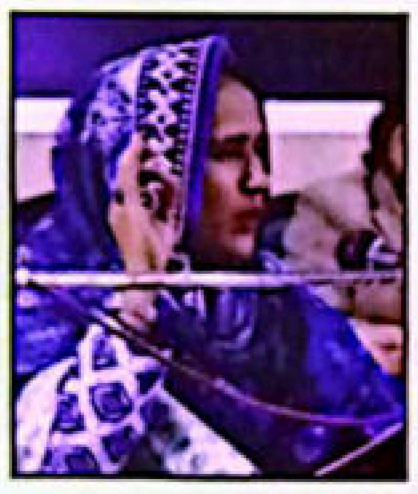

زرین منور

راجزوودان

احمد علی کیف

طارق جاوید

عبداللہ نشاط

ارشد نذیر کاٹھیا

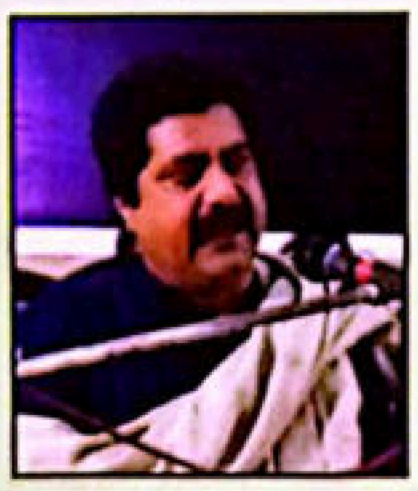

احمد اقبال بزمی

پھولوں کا تبادلہ کیا گیا

شرکاء میں یادگاری شیلڈز تقسیم کی گئیں

مہمانوں کے اعزاز میں رانا بابر حسین ایم پی اے نے ظہرانے کا اہتمام کیا

سامعین کا ذوق وشوق دیدنی تھا

CamScanner